ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

ISSN: 2321-8339 جنوری۔مارچ ۲۰۱۵ء

- سیرتِ نبوی اور اس کے مآخذ
  سید جلال الدین عمری
- اسلام کی حفاظت واشاعت میں نجاشیؓ کا کردار
  پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی
- شہریت کا مسئلہ۔اسلامی نقطۂ نظر
  مولانا اختر امام عادل قاسمی
- سرکاری مناصب وذرائع کا استعمال
  جناب عبدالمبین
- ابن سید الناسؒ اور ان کی کتاب سیرت
  حافظہ صبیحہ منیر
- مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۂ فیل۔ایک تنقیدی جائزہ
  شیخ عبدالرحمٰن بن یحییٰ المعلمی الیمانی
- تعارف وتبصرہ
  محمد رضی الاسلام ندوی
  محمد رضوان خان

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کے منصوبہ کے تحت تیار کردہ

۲ اہم کتابیں

اسلام کی امتیازی خصوصیات ..... مولانا محمد جرجیس کریمی

اس کتاب میں مصنف نے اسلام کی چند اہم اور نمایاں خصوصیات کا مطالعہ پیش کیا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کی خصوصیات اور محاسن کی تلاش اور مطالعہ کا رجحان پیدا ہو اور اس پر ان کا اعتماد و ایمان بھی بحال ہوتا کہ وہ اپنے دین کی حقانیت اور ہمہ گیری کے بارے میں کسی شک وشبہ میں مبتلا نہ ہوں۔

● سائز: $\frac{23 \times 36}{16}$ ● صفحات: 212 ● قیمت: 100.00

حضرت ابراہیمؑ - امامِ انسانیت ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

اس کتاب میں ابوالانبیاء خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داعیانہ زندگی اور دعوتی وتبلیغی جدّ وجہد کا ایک جامع مرقع پیش کیا گیا ہے اور ملّتِ ابراہیمی کے بنیادی عناصر، ملّتِ ابراہیمی کے حاملین، ملّتِ ابراہیمی سے انحراف، ملّتِ ابراہیمی اور اسلام، نصاریٰ اور ملّتِ ابراہیمی جیسے اہم موضوعات پر محققانہ اور داعیانہ بحث کی گئی ہے۔ ایک ایسی جامع اور تحقیقی کتاب جو ملّتِ ابراہیمی سے متعارف کرانے کے ساتھ اسوۂ ابراہیمی سے بھی روشناس کراتی ہے۔

● سائز: $\frac{23 \times 36}{16}$ ● صفحات: 200 ● قیمت: 85.00

ملنے کے پتے

۱۔ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، نئی نگر، پوسٹ بکس ۹۳، علی گڑھ۔ ۲

۲۔ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز D-307 ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔ ۲۵

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جنوری _____ مارچ ۲۰۱۵ء

مدیر

سیّد جَلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۲

ISSN: 2321-8339

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد: ۳۴ شمارہ:۱

ربیع الاول ـــــــــ جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ

جنوری ـــــــــ مارچ ۲۰۱۵ء

- مجلہ کے تمام شمارے www.tahqeeqat.net پر لوڈ کردیے گئے ہیں
- مقالہ نگار حضرات اپنے مقالات صرف tahqeeqat@gmail.com پر ارسال کریں۔
- انتظامی امور سے متعلق رابطہ کے ذرائع:

فون: 0571-2902034 موبائل: 09897655171

ای میل: tahqeeqateislami@gmail.com tahqeeqat_islami@yahoo.com

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۴۰ روپے
سالانہ	۱۵۰ روپے
پانچ سال کے لیے	۶۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں و ادارے)	۲۰۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰/امریکی ڈالر
سالانہ (ادارے)	۲۵/امریکی ڈالر

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۲۵/امریکی ڈالر
سالانہ (ادارے)	۳۰/امریکی ڈالر

طابع و ناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی ـ۶ سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور) علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

سیرتِ نبوی اور اس کے مآخذ — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

اسلام کی حفاظت واشاعت میں نجاشی کا کردار — پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی — ۱۳

بحث ونظر

شہریت کا مسئلہ۔ اسلامی نقطۂ نظر — مولانا اختر امام عادل قاسمی — ۳۱

سرکاری مناصب وذرائع کا استعمال۔ تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں — جناب عبدالمہیمن — ۶۳

سیر وسوانح

ابن سید الناسؒ اور ان کی کتابِ سیرت — حافظہ صبیحہ منیر — ۷۹

ترجمہ وتلخیص

مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۂ فیل۔ ایک تنقیدی جائزہ — شیخ عبدالرحمن المعلمی الیمانی، مترجم: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۹۵

تعارف وتبصرہ

مالیاتی نظام کا قیام — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۷

عرفانِ شبلی — ،، ،، — ۱۱۸

شعاعِ نوا — محمد رضوان خاں — ۱۱۹

خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۵۴) — ۱۲۰

مضامین کا انگریزی خلاصہ — ۱۲۱۔۱۲۸

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

سابق صدر ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

mnz_comp@yahoo.in

۲۔ مولانا اختر امام عادل قاسمی

مہتمم جامعہ ربانی، منورواشریف، ضلع سمستی پور، بہار

aiadil.akhtar@gmail.com

۳۔ جناب عبدالمہیمن

صدر شعبۂ اسلامیات، ہری پور یونی ورسٹی (پاکستان)

muhaimin74@gmail.com

۴۔ حافظہ صبیحہ منیر

اسکالر شعبۂ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور (پاکستان)

hafizasabihamunir@gmail.com

۵۔ شیخ عبدالرحمن المعلّمی الیمانیؒ

سابق رکن دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد

۶۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

سکریٹری تصنیفی اکیڈمی، جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی

mrnadvi@yahoo.com

۷۔ جناب محمد رضوان خاں

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، نئی دہلی

afeefrizwan@gmail.com

۸۔ سید جلال الدین عمری

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

حرفِ آغاز

سیرتِ نبوی اور اس کے مآخذ

سید جلال الدین عمری

صدرِ ادارہ و امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری سیرت سے متعلق موضوعات پر بھی برابر لکھتے رہے ہیں۔ ان کے مقالات مجلہ تحقیقاتِ اسلامی اور ماہ نامہ زندگی میں شائع ہوئے ہیں۔ نیز بعض تحریریں الگ سے کتابچوں کی صورت میں بھی طبع ہوئی ہیں۔ ان کا ایک ضخیم مجموعہ **'اوراقِ سیرت'** کے نام سے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی ~~سے جلد شائع ہونے والا~~ ہے۔ اس کے لیے مولانا نے جو پیش لفظ تحریر فرمایا ہے، اسے افادیت کے پیشِ نظر ذیل میں شائع کیا جارہا ہے۔ اس سے زیرِ اشاعت مجموعہ کے مشتملات کا علم ہوگا اور اس کی تحقیقی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔ (رضی الاسلام)

اللہ تعالیٰ کے رسول، سرورِ دو عالم، محمد عربیؐ، فداہ ابی وامی کی حیاتِ طیبہ ہر اس شخص کے لیے اسوۂ حسنہ ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے (الاحزاب: ۲۱) اسی سے بے خطا راہ نمائی مل سکتی ہے اور یہی دارین کی سعادت کا ذریعہ ہے۔ اس جہانِ فانی میں بڑے بڑے مفکرین، مصلحین اور دانش ور پیدا ہوئے، لیکن آپؐ جیسا ہمہ صفت راہ نما اسے نہ مل سکا۔ تاریخ کے ہر دور میں اور ہر قوم میں اللہ کے رسول آئے اور راہِ ہدایت دکھاتے رہے۔ دنیا کو آخری رسول کی آمد کا صدیوں سے انتظار تھا۔ رسولِ خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے یہ طویل عرصۂ انتظار ختم ہوا۔ آپ سلسلۂ رسالت کی آخری کڑی ثابت ہوئے اور ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کیے گئے۔ آپ کی شریعت آخری شریعت قرار پائی۔ اس نے تمام سابقہ شریعتوں کو منسوخ کر دیا۔ اب آپ ہی کی راہ نمائی سب کے لیے ہے اور تا قیامت ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: لَوْ کَانَ مُوسٰی حَیًّا لَمَا

ا۔ مناوی، فیض القدیر۔ یہ حدیث الفاظ کے فرق کے ساتھ مختلف مناسبتوں سے مسند احمد، دارمی، بیہقی، ابن حبان، مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں صحیح سندوں کے ساتھ مروی ہے۔

وَسِعُہ اِلاّ اتّبَاعِی ا ۔(اگر موسیٰ [علیہ السلام] بھی زندہ ہوتے تو انھیں میری اتباع کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوتا)۔

تاروں سے یہ کہہ دو کوچ کریں ، خورشید منور آتے ہیں
قوموں کے پیمبر آتو چکے ،اب سب کے پیمبر آتے ہیں

جب کبھی کسی عنوان سے آپؐ کی سیرتِ مقدسہ کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی تو آپ کی عظمت کے نقوش دل و دماغ پر مرتسم ہوگئے اور یوں محسوس ہوا جیسے اس ناقص اور ادھوری دنیامیں انسان کامل کو پالیا۔جس پہلو سے دیکھا، آپؐ کی حیاتِ مبارکہ آفتاب سے زیادہ تاب ناک نظر آئی۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

مطالعۂ سیرت کے دوران میں رہ رہ کر جی چاہتا اور ایک تمنا سی دل میں مچلنے لگتی کہ کاش یہ گناہ گار آپ کی سیرت مقدسہ اپنے الفاظ میں بیان کرتا۔اس کی دنیائے علم میں کوئی قدر و قیمت نہ ہوتو بھی اس کے لیے باعث سعادت اور سرمایۂ آخرت ہوگی، لیکن جب دیکھتا کہ آپ کی رحلت کے بعد ہی سے سیرت نگاری کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ اس پر بڑے بڑے اساطینِ علم اور نام ورسیرت نگاروں کی انتہائی کوششیں صرف ہوئی ہیں اور ہر ایک نے اپنے نہج سے یہ خدمت انجام دی ہےتو اپنی کم مایگی بلکہ بے مایگی کا احساس دامن گیر ہوجاتا اور اس خیال سے ہمت جواب دینے لگتی: 'هَل غادَر الشُّعَراءُ مِن مُتَرَدِّمٍ' (کیا گزشتہ شعراء نے بعد والوں کے لیے کچھ چھوڑا ہے کہ وہ طبع آزمائی کریں) اس کے ساتھ یہ خیال بھی بہت دور ذہن کے کسی گوشہ میں ابھرتا، جیسے سات سمندر پار سے کوئی آواز آرہی ہو: کَم تَرَکَ الأوَّلُ لِلآخِر (اگلوں نے بعد والوں کے لیے بہت کچھ چھوڑا ہے) اس سے امید کی کلی کھلنے لگتی اور آرزوئے دل کے پورا ہونے کی توقع ہونے لگتی۔ وقت کی رفتار کے ساتھ دل و دماغ پر یہ تصور چھاتا چلا گیا کہ اپنی کم علمی کی وجہ سے سیرت کے بالکل نئے گوشے نہ بھی تلاش کیے جاسکیں تو بعض پہلوؤں کو نمایاں کیا جاسکتا ہے۔ اسی احساس کے تحت کبھی کبھی قلم کو حرکت ہوئی اور متعدد

مضامین ضبطِ تحریر میں آ گئے۔ اب ان ہی مضامین کو ضروری حذف و اضافہ کے بعد یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ ان مضامین کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ آب و تابِ سیرت: رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح پر قدیم و جدید مصنفین نے اپنے اپنے اسلوب میں پوری تفصیل فراہم کردی ہے۔ راقم نے رحمۃ للعالمین کے عنوان سے بہت ہی اختصار کے ساتھ آپؐ کی سیرت اور اساسی تعلیمات پیش کی ہیں۔ اس میں حوالوں کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ اسی مجموعہ کے دوسرے مضامین میں اس کے بیش تر حوالے موجود ہیں۔ اس کے بعد ایک مضمون میں قرآن مجید کے حوالہ سے مشرکین، اہلِ کتاب اور تمام نوعِ انسانی کو آپؐ کی دعوتِ عام کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کارِ دعوت کو جاری رکھنا امتِ مسلمہ کی ذمہ داری ہے۔ یہ اس کا فرض منصبی ہے۔ قرآن مجید نے آپؐ کی سیرت کو آپ کی رسالت کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے (یونس: ۱۶)۔ ایک مضمون میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس سلسلہ کے ایک مضمون میں ختمِ نبوت اور اس کے دلائل کا ذکر ہے۔

۲۔ دعوتِ اسلام: اس باب کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت، اس کے مراحل اور آپؐ کی حکمت عملی کا ذکر ہے۔ یہ اس مجموعہ کا سب سے وسیع باب ہے۔ اسے مکی اور مدنی دو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مکی دور میں اعلانِ رسالت، اس کا سب سے پہلے استقبال کرنے والوں کا ذکر، دعوتِ عام، ردِّ عمل اور آزمائشیں، ہجرتِ حبشہ، مواخاتِ مکہ، غیر مسلم سرداران قبائل سے تعاون کی درخواست، جیسے مضامین آئے ہیں۔ مدنی دور سے متعلق مضامین میں ہجرتِ مدینہ اور اس کی تاریخی اہمیت، صلح حدیبیہ کی ایک دفعہ کی وضاحت، آپؐ کے تبلیغی احکام و ہدایات، فرماں روانِ عالم کو دعوتی مکاتیب اور وفودِ عرب کی مدینہ آمد، جیسے مباحث شامل ہیں۔ ان میں سے بعض مباحث ایک ہی عنوان کے تحت شائع ہوئے تھے۔ یہاں انہیں الگ الگ عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے اور بعض مضامین میں نئے مواد کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۳۔ علمی احسانات: اس باب کے ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی دین میں حجت ہیں۔ دونوں اساسِ دین ہیں۔ ایک مضمون میں علم کی فضیلت و اہمیت اور اس کی ترغیب و تشویق سے متعلق آپؐ کے ارشادات کی

کسی قدر تشریح ہے۔ایک اور مضمون میں آپ کے علمی احسانات اور اس کے لیے عملی اقدامات کا ذکرِ خیر ہے۔مسجد نبوی سے متصل صفہ کی حیثیت درس گاہِ نبوی کی تھی، جہاں سے حاملینِ علوم نبوت تیار ہوئے۔اس سلسلہ کے آخری مضمون میں اس کا تفصیلی ذکر ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہمہ صفت تھی۔یہ شاعری نہیں، حقیقت ہے۔

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری
آں چہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری

آپؐ کی زندگی کے کسی پہلو کو حیطۂ تحریر میں لانے کے لیے علمی بصیرت اور ژرف نگاہی کے ساتھ طہارتِ قلب و نظر، آپؐ کی ذات سے محبت اور جذبۂ اطاعت کا پایا جانا ضروری ہے۔یہ بندۂ عاجز ان دونوں خوبیوں سے محروم ہے، لیکن سیرت کا مطالعہ اپنی اصلاح کا بھی بڑا ذریعہ ہے۔دورانِ مطالعہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ظلمت کدۂ قلب میں روشنی کی کرن پھوٹ رہی ہے اور آپؐ کے نقوش قدم کی پیروی کا جذبہ ابھر رہا ہے۔دعا ہے کہ اس طرح دل کی کثافتیں دور ہوں اور جو پاکیزہ جذبہ گاہے گاہے ابھرتا ہے، مستقل ہو جائے۔

ان مضامین کا زمانۂ تحریر تقریباً نصف صدی پر پھیلا ہوا ہے۔مختلف اوقات میں یہ قلم بند ہوتے رہے۔کبھی کبھی ان کے درمیان طویل وقفہ بھی رہا۔اس وجہ سے ان میں کہیں کہیں تکرار کا احساس ہوتا ہے۔چوں کہ ان میں سے ہر مضمون اپنی جگہ مستقل ہے، اس لیے اسے باقی رکھا گیا ہے۔اسے مضمون کی ضرورت سمجھنا چاہیے۔

مجھے خوشی ہے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ان مضامین کو اہلِ علم نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور ان کے بعض عنوانات کو مزید مطالعہ اور تحقیق کا موضوع بنایا اور انھیں آگے بڑھانے کی کوشش کی۔یہ میرے لیے ہمت افزائی کا باعث بھی ہے۔

اے اللہ! میں نے تیرے حبیب رہ نمائے عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کتابِ سیرت کے چند اوراق پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔اے اللہ! ان بے جان اوراق میں اپنے فضل و کرم سے جان ڈال دے اور قلم کی سیاہی کو جلوۂ نور سے بدل دے کہ اس کی تابانی سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔قلم نے جہاں کہیں لغزش کھائی ہے، اسے درگزر فرما اور شرفِ قبولیت سے نواز دے۔

اے اللہ! یہ جو کچھ ہوا ہے، تیرے کرم سے ہوا ہے اور جو کچھ ہوگا، تیرے کرم ہی سے ہوگا۔ اے اللہ! تو غنی از ہر دو عالم اور ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ میں تیرے لطف و عنایت کا محتاج ہوں اور تاابد محتاج رہوں گا، اے اللہ! تیرے رسول ﷺ نے زندگی کی جو صراطِ مستقیم دکھائی ہے، اس پر چلنے کی توفیق عطا فرما اور استقامت سے نواز دے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۔

ماخذِ سیرت

قرآن مجید رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا سب سے مستند ماخذ ہے۔ اس میں آپؐ کی حیاتِ مبارکہ کے مختلف پہلو، کہیں اجمال اور کہیں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ اس سے آپؐ کی بعثت سے پہلے عرب کی حالت، ان کے عقائد، ان کی روایات اور بعثت کے بعد آپؐ کی تبلیغ و دعوت اور مخالفین کا ردِّ عمل سامنے آتا ہے۔ آپؐ کے اولین مخاطب مشرکین عرب کے ساتھ اہلِ کتاب بھی تھے۔ قرآن مجید میں ان کی دینی اور اخلاقی پستی، کتاب اللہ میں ان کی تحریفات، رسول اللہ ﷺ سے ان کی عداوت اور سازشوں کا ذکر ہے اور ان سے بچنے کی تدابیر بیان ہوئی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان میں صالح افراد بھی ہیں، جو قابل تعریف ہیں۔ اسی طرح مخلص صحابہ کرامؓ کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے تعلق، ان کا اخلاص، ان کی دعوتی جدوجہد اور قربانیاں، دوسری طرف منافقین کا ناپسندیدہ کردار اور ان کی ریشہ دوانیاں بھی زیر بحث آئی ہیں۔ قرآن مجید میں آپؐ کی عبادات، اللہ تعالیٰ سے آپؐ کا تعلق، آپؐ کے اخلاق کریمانہ، آپؐ کی خانگی زندگی اور آپؐ کے غزوات کی بھی کسی قدر تفصیل موجود ہے۔ اس مجموعہ کے بعض مضامین قرآن ہی کی روشنی میں تحریر کیے گئے ہیں اور دوسرے مضامین میں بھی اس کی تعلیمات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

سیرت کا دوسرا ماخذ کتبِ حدیث ہیں۔ ان کتابوں کا مقصد ہی رسول اللہ ﷺ کے قول و عمل اور آپؐ کی تقریر (جس عمل پر آپؐ نے نکیر نہیں کی اور سکوت اختیار فرمایا) کو محفوظ کرنا ہے۔ کتبِ حدیث میں وحی و رسالت، آپؐ کی دعوتی جدوجہد، آپؐ کی عبادات، آپؐ کے شب و روز کے معمولات، آپؐ کے اخلاق، آپؐ کا زہد و غنا، آپؐ

کی معیشت، آپؐ کا لباس اور پوشاک اور وضع قطع کی تفصیلات ملتی ہیں۔ اسی طرح عبادات، نکاح و طلاق، تجارت اور معیشت، جہاد فی سبیل اللہ، مغازی، امن و صلح، حکومت و سیاست اور حدود وتعزیرات جیسے تمام امور میں آپؐ کی تعلیمات اور آپؐ کے اقدامات کی تفصیلات موجود ہیں۔ کتبِ حدیث میں صحیح روایات کے ساتھ ضعیف روایات بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن ان کی چھان بین کی جو بے نظیر کوشش محدثین نے کی ہے، اس سے ان کی صحت وضعف کا فیصلہ آسانی سے ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے اسماء الرجال کے وسیع ذخیرہ سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ انھیں درایت کے معیار پر بھی پرکھا جاسکتا ہے۔ ان مضامین میں ممکنہ حد تک سیرت کے سلسلے میں حدیث سے استفادہ کیا گیا ہے اور کہیں کہیں حدیث کے حوالے کے ساتھ روایت و درایت کے پہلو سے اس کے مقام کے تعیین کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ ہوسکتا ہے، بعض اوقات یہ عام دلچسپی کا باعث نہ ہو، لیکن توقع ہے کہ اس سے ان مضامین کو استناد حاصل ہوگا۔

سیرت کا ایک اہم ماخذ وہ کتبِ سیرت ہیں جو خاص اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں سوانحِ سیرت کے ہمہ جہت احاطہ کی کوشش کی گئی ہے۔ جن واقعات کی طرف قرآن اور حدیث میں اشارے ہیں یا مجملاً ان کا ذکر ہے، کتبِ سیرت میں ان کی از اوّل تا آخر پوری تفصیل موجود ہے۔ بہ طور مثال ہجرتِ حبشہ یا ہجرتِ مدینہ کا ذکر آئے تو کتبِ سیرت ان افراد کی تعداد، ان کے نام اور سفر کی کیفیت بھی بیان کردیتی ہیں، جنھوں نے ہجرت کی۔ اسی طرح غزوات کا تذکرہ ہو تو چھوٹے بڑے غزوات و سرایا، ان کا پس منظر، ان میں شریک افراد، شہداءِ اسلام اور فریق مخالف کی ہلاکتوں کی تفصیل بھی کتب سیرت میں مل جاتی ہے۔

اسلامی تاریخ کے دورِ اول میں کتبِ حدیث اور کتبِ سیرت کی تالیف و تدوین کا عمل ایک ساتھ شروع ہوا۔ علماء امت کی دونوں ہی کی طرف توجہ رہی۔ پہلی صدی کے بعد جو سیرت نگار نمایاں مقام کے حامل رہے ہیں اور انھوں نے اپنے پیش رو اصحاب کی روایات اور تصانیف سے بھی استفادہ کیا اور خود بھی اپنے ذرائع سے نئی معلومات فراہم

کیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ محمد بن عمر الواقدی (م ۲۰۷ھ)۔ واقدی نے سیرت کے مختلف پہلوؤں پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان کا خاص موضوع مغازی رہا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے کی سب سے زیادہ معلومات فراہم کی ہیں۔ سیرت نگاروں نے ان پر اعتماد کیا ہے، لیکن محدثین کے نزدیک ان کی شخصیت متنازع رہی ہے۔

۲۔ محمد بن سعد بن منیع البصری (۱۶۸-۲۳۰ھ)۔ ابن سعد اہل علم کے نزدیک ثقہ اور قابل اعتماد ہیں۔ وہ کاتب الواقدی مشہور ہیں۔ ان پر اس پہلو سے جرح کی گئی ہے کہ واقدی پر ان کا زیادہ اعتماد رہا ہے، ان کی معلومات کا بڑا ذریعہ واقدی کی تصنیفات ہیں۔ اس کے باوجود ان کی کتاب 'الطبقات الکبریٰ' سیرت کا ایک اہم ماخذ ہے۔ اس میں انھوں نے واقدی کے علاوہ اپنے پیش رو دیگر مصنفین سے فائدہ اٹھایا ہے۔

۳۔ محمد بن اسحٰق (پیدائش: ۸۵ھ، وفات: ۱۵۱ اور ۱۵۳ھ کے درمیان)۔ تاریخ اور سیرت پر ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں سیرت کا مختلف پہلوؤں سے احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کی شخصیت اہلِ علم کے درمیان زیرِ بحث رہی ہے۔ بعض نے انھیں ثقہ اور قابل اعتماد قرار دیا ہے تو بعض نے ان پر جرح بھی کی ہے اور ان کے پیش کردہ مواد اور معلومات پر شک وشبہ کا اظہار کیا ہے۔

۴۔ ابن ہشام (محمد عبدالملک بن ہشام بن ایوب الحمیری م ۲۱۸ھ) نے ابن اسحٰق کی سیرت کی تلخیص وتہذیب کی، غیر متعلق مباحث کو حذف کیا اور فروگزاشتوں کی اصلاح کی۔ ابن ہشام کی اس خدمت کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور سیرتِ ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی سیرت کی جگہ لے لی، اس کی شرحیں لکھی گئیں اور تلخیص بھی کی گئی۔ سیرت نگاروں کا اس پر بڑا اعتماد رہا ہے۔

۵۔ طبری (م ۳۱۰ھ)۔ ان حضرات کے بعد امام ابن جریر طبری نے 'تاریخ الامم والملوک' تصنیف کی۔ اس میں ابتداء آفرینش سے اپنے دور تک کے حالات جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں سیرت کے متعلق معلومات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

طبری مورخ ہی نہیں، مفسر اور فقیہ بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے پیش رو سیرت نگاروں کے مواد کو ممکنہ تحقیق کے ساتھ جمع کیا ہے۔

یہ پانچ شخصیات وہ ہیں جو سیرت کے میدان میں سب سے نمایاں مقام کی حامل ہیں اور جن کی تصنیفات کو بنیادی مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے علاوہ بعض اور اصحاب نے بھی سیرت پر براہِ راست معلومات فراہم کی ہیں، لیکن متاخرین نے ان ہی پانچ پر زیادہ تر اعتماد کیا ہے، ان ہی کی تصنیفات سے اخذ و استفادہ کیا ہے اور ان ہی کے فراہم کردہ مواد کو اپنے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

سیرت کے میدان میں ان کوششوں کی قدر و قیمت تسلیم شدہ ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حدیث کی طرح سیرت کے سلسلے میں صحت کا اہتمام نہیں ہوا۔ ان کی چھان بین اور تحقیق کا حق ادا ہوا نہ اس کے لیے اصولِ حدیث کی طرح اصول وضع ہوئے۔ اس وجہ سے ان میں ضعیف اور قوی، قابلِ اعتماد اور نا قابلِ اعتبار، ہر طرح کی روایات جمع ہوگئیں۔ اسی لیے اہلِ علم نے توجہ دلائی ہے کہ ان سے واقعاتِ سیرت اخذ کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔[۱]

کتبِ سیرت میں معروف اور مشہور روایات کے ساتھ شاذ روایات بھی ملتی ہیں۔ ان سے جدّت اور نئے پن کا احساس ہوتا ہے اور قاری چونکتا ہے۔ ان کی بنیاد پر مشہور روایات کی تردید کی جاسکتی ہے اور بعض اوقات کی بھی جاتی ہے، جو حزم و احتیاط کے منافی ہے۔ پیشِ نظر مضامین میں کتبِ سیرت سے اخذ واستفادہ میں دو باتوں کا خیال رکھا گیا ہے:

ایک یہ کہ مشہور روایات کو بنیاد بنایا جائے اور شاذ روایات سے احتراز کیا جائے۔ دوسرے اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ان ہی روایات کو لیا جائے جنھیں ان سیرت نگاروں نے نقل کیا ہے جو ائمۂ حدیث اور اس فن کے ماہر ہیں، جیسے امام ذہبی، علّامہ ابنِ کثیر، علّامہ ابنِ قیم اور حافظ ابنِ حجر رحمہم اللہ۔ کہیں کہیں اس میں کوتاہی بھی ہوئی ہوگی۔ بہرحال ان مضامین کو اپنی حد تک معتبر بنانے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن انسان کی کوئی بھی کوشش خامیوں سے پاک نہیں ہوسکتی۔ والعصمۃ والعظمۃ للہ وحدہ۔ ☆☆☆

---

[۱] اس کی کسی قدر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۱ / ۳، ۴

تحقیق وتنقید

اسلام کی حفاظت و اشاعت میں نجاشیؓ کا کردار

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

'مکی اسوۂ نبوی' کی تالیف کے دوران راقم سطور کی ساری توجہ مکی دور میں حبشہ کی مسلم امت کے کردار و عمل پر مرکوز رہی۔ ا۔ اپنی بے بصیرتی کا بھی اعتراف ہے کہ اس وقت بہت سے اہم ترین اور شخصیت ساز گوشے اور عہد آفرین واقعات نظر سے اوجھل رہے۔ عام سیرت نگاروں اور اکابر محققین کے رویے کی توجیہ یوں کی جاسکتی ہے کہ وہ ان کا میدانِ تحقیق ہی نہ تھا۔ تاہم ان کی نگارشات وتحقیقات نے مکی و مدنی دور کی حبشی مسلم امت اور ان کے سربراہ کے کردار و عمل کا خوب جائزہ لیا۔ اگرچہ وہ معلومات و جزئیات کی کمی کی وجہ سے تشنہ رہا۔ اس موضوع کی روایات تو جمع کردی گئیں، لیکن ان کا تجزیہ نہ ہوسکا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ ایک الگ بابِ تحقیق کا موضوع تھا، جسے وہ اپنے تاریخی بیانیے میں کھپا نہ سکے۔ ۲۔ بیش تر سیرت نگاروں نے ایک دو کتابوں کی تالیف یا چند مضامین و مقالات کی تصنیف کے بعد قلمِ تحقیق ہاتھ سے رکھ دیا۔ خاک سار راقم پر خاص فضل و کرمِ الٰہی رہا کہ سیرت نگاری کے مختلف اور نئے نئے موضوعات و جہات پر قلم فرسائی کرتا رہا۔ ۳۔ مختلف اسباب سے موضوعِ زیر بحث پر تحقیق کرنے کا خیال آیا اور مطالعہ اور فکر و تدبر نے اس کے خدوخال واضح کیے۔ لہٰذا اس وقیع موضوع پر مطالعۂ خاک سار پیش خدمت ہے:

محفوظ ملک

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اذن وحکم سے معاند قریشی عوام وخواص کے ستائے

ہوئے مسلمانانِ مکہ نے سرزمینِ حبشہ کی طرف ہجرت کی، کیونکہ وہ بہ فرمانِ نبوی 'ارضِ عدل وصدق' تھی اور اس کے حکم رانِ عادل نجاشی کے ملک میں کسی پر ظلم و جبر نہیں کیا جاتا تھا، حالاں کہ وہ ایک غیر عرب ملک تھا، جو بحر احمر کے پار افریقہ میں واقع تھا اور اس کا حکم راں عقیدہ و مذہب کے لحاظ سے عیسائی تھا۔ قدیم ترین سیرت نگاروں کے سرخیل ابن اسحاق نے بلاسند یہ فرمانِ نبوی نقل کیا ہے: ''لو خرجتم الیٰ ارض الحبشۃ فان بھا مَلِکاً لا یظلم عندہ احد، وھی أرض صدق، حتی یجعل اللہ لکم فرجاً مما انتم فیہ'' (تم لوگ سرزمین حبشہ میں چلے جاؤ۔ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے یہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔ وہ پاک سرزمین ہے۔ وہاں اس وقت تک رہو جب تک اللہ تعالیٰ تمہارے معاملے میں کوئی کشادگی نہ پیدا کردے''۔ اس حدیث کے دوسرے اطراف بھی ہیں جو دوسری کتبِ سیرت وحدیث میں موجود ہیں۔ ابن اسحاق کی روایات کے ایک اہم خوشہ چیں ابن سیدالناس نے ان میں سے ایک کو بیان کیا ہے اور وہ امام عبدالرزاق کی حدیث ہے۔ بخاری کی بحث 'ہجرۃ الحبشۃ' کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس کا دوسرا طرف مختلف الفاظ میں ابن اسحاق جیسا ہی نقل کیا ہے۔ امامانِ حدیث وسیرت اور ان کے شارحین کرام نے نہ اس حدیثِ نبوی پر بحث کی ہے اور نہ اس کے ماخذ وسرچشمہ کا حوالہ دیا ہے۔ ۴؎ بہرکیف یہ واضح ہے کہ وہ وحی الٰہی اور ہدایتِ ربانی پر مبنی فرمان تھا، کیوں کہ آپؐ کی احادیث بھی قرآنی وحی کی طرح وحی ربانی ہوتی تھیں۔ ظاہری طور پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اپنی حکمتِ بالغہ سے مختلف امصار و دیار اور ان کے اکابر کے بارے میں واقفیت رکھتے تھے۔ ۵؎

مکی مسلمانوں کی ہجرت

نبوت کے پانچویں اور چھٹے سال مختلف قریشی خاندانوں سے تعلق رکھنے والے تقریباً سو مسلمان مختلف مرحلوں میں حبشہ کو ہجرت کرگئے۔ ان میں بیش تر نوجوانانِ قریش تھے، جن میں کنوارے بھی تھے اور شادی شدہ بھی، جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ

مامون ملک میں پناہ لینے گئے تھے۔ ان کی حفاظت کی خاطر رسولِ اکرم ﷺ نے شاہِ حبشہ نجاشی کو فرمان نامہ بھی ارسال فرمایا تھا، جس میں ان کو قریشی مظالم سے بچانے کا مضمون تھا۔ روایات کے مطابق بنو ہاشم و بنومطلب کے شیخ اور رسول اکرم ﷺ کے چچا ابوطالب بن عبدالمطلب ہاشمی نے بھی بعض خطوط لکھے تھے۔ مہاجرینِ حبشہ کے بیانات کو رسول اکرم ﷺ کے فرمانِ وحی آمیز نے مستند کیا تھا اور خطوطِ ابوطالب نے ایک شیخِ مکہ کی درخواست سے اس کو مزید سیاسی اور سفارتی تقویت پہنچائی تھی۔ ان سب سے زیادہ خود نجاشی کی مظالم رسیدہ قوم کی حفاظت کی جبلّت تھی۔ مکی مہاجرینِ حبشہ کی ایک پڑوسی ملک میں سکون واطمینان کی زندگی اور اپنے دین و مذہب کے مطابق عبادت گذاری معاندا کابر قریش کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ انھوں نے قومی مجلس میں بحث وفیصلہ کے مطابق پناہ گزیں مکیوں کو حبشہ سے واپس لانے کا منصوبہ بنایا اور زیرک وحکیم سفارت کاروں کے وفود بھیجے۔ حضرت عمرو بن العاص سہمیؓ، جو دورِ جاہلی میں اپنی حکمت و دانش اور سفارت کاری کے داؤ پیچ اور سیادت و سیاست کے فن کے ماہر تھے، وہی سربراہِ وفود رہے تھے، مگر ان کے تمام سماجی، دینی، علاقائی اور سفارتی کارناموں کا نتیجہ صفر رہا اور وہ پناہ گزینوں کو واپس لانے میں ناکام رہے۔ ان کے بعض ارکانِ وفد اور مکہ مکرمہ کے بہت سے اکابر وشیوخ مظالم کے خلاف بھی تھے اور پناہ گزیں مہاجرین کے خلاف سخت اقدامات کے مخالف بھی کہ وہ بہرحال ان کے اپنے عزیز وقریب تھے اور ان سے خون وقرابت کے گہرے رشتے تھے، کیا ہوا کہ وہ جدا دین رکھتے تھے۔ ۶؎

نجاشی کا حکیمانہ عدل وانصاف

غریب الوطنی، عزیزوں اور رشتہ داروں سے مفارقت اور مقامی لوگوں کے استہزاء وغیرہ کا مداوا کوئی حکومت نہیں کرسکتی۔ طاقت وحکومت کے ذریعہ قانون بنایا اور نافذ کیا جاسکتا ہے اور نجاشی نے وہ کیا بھی، لیکن سماجی خوف اور پریشان حالی کے لیے کچھ نہ کرسکے۔ نجاشی نے بہرحال قوانین کے ذریعہ مہاجرینِ حبشہ کی حفاظت کے ساتھ سماجِ غیر میں مہذب سلوک کی

جدوجہد بھی کی۔ قانونی طور سے ان کا ایک عادلانہ کام یہ تھا کہ اگر کوئی حبشی یا عیسائی شہری مسلم مہاجرین میں سے کسی کو کسی قسم کی اذیت دے گا تو اسے چار درہم جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ غالباً اس کے بعد بھی زبانی تعذیب اور سماجی طنز وتشنیع کا سلسلہ کسی حد تک جاری رہا تو مہاجرین کی درخواست پر کہ یہ رقمِ جرمانہ روک تھام میں ناکافی ہے، نجاشی نے اسے دوگنا یعنی آٹھ درہم کردیا۔ یہ تدبیر خاصی موثر رہی۔ تاہم غیرملک میں مہاجرین حبشہ کے ساتھ بیگانگی اور سرد مہری کا جو سلوک ہوتا رہا، وہ بھی سوہانِ روح تھا، جیسا کہ حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمیؓ کی زوجۂ مہاجرہ حضرت اسماء بنت عمیسؓ کا بیان صحیح بخاری وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔حکومتی اور انتظامی سطح پر بہرحال حضرت نجاشی نے ایک دوسرا حکم جاری کیا کہ مہاجرینِ حبشہ کے لیے کھانے اور کپڑے کا انتظام سرکاری خزانے سے کیا جائے: "اُمِرَ لَنَا بِطَعَامٍ وکِسوَۃٍ" جیسا کہ ابن کثیر نے حافظ ابونعیم کی دلائل النبوۃ کی بنا پر لکھا ہے۔ سرکاری کفالت کا یہ اقدام صرف اس بنا پر کیا گیا کہ حکم راں مہرباں اور عادل تھا اور مقامی آبادی کی اکثریت بے نیاز و بے مروّت تھی۔[۷]

مہاجرین کو تجارتی مراعات

قدیم جاہلی دور سے قریشِ مکہ اور دوسرے طبقات اور خاندانوں کے حبشہ سے گہرے تجارتی تعلقات چلے آرہے تھے۔ وہ مکی دورِنبوی میں بھی جاری رہے اور قریشی اکابر اور مکی سوداگر برابر عرب حبشہ تجارت کے باہمی کاروبار میں مشغول رہے تھے۔عربی اور قریشی تاجر ہر سال کے ہر زمانے میں حبشہ تجارت کے لیے مسلسل آتے رہتے تھے، کیوں کہ وہ ان کی خاصی اہم تجارتی منڈی تھی۔ یہاں تک کہ جب قریشی وفود اور ان کے اشراف و سفارت کار مہاجرینِ حبشہ کے انخلا اور خروج کے مقصد سے گئے تو سامانِ تجارت ساتھ لے گئے۔ یہ دراصل قریشی اور عرب تجارت کا ایک اصول و دستور تھا کہ جنگ وامن کسی بھی موقعہ پر تجارت اور کاروبار کو نہیں بھولتے تھے۔حبشہ میں مکی سامانِ تجارت میں چمڑے کے سامان ۔کھالوں اور دوسری مصنوعات۔کی بڑی مانگ تھی اور وہ

زیادہ سے زیادہ تعداد میں لاتے تھے۔ اسی طرح حبشی تاجر و کاروباری عرب کی مختلف منڈیوں، خاص کر مکہ اور طائف کے قرب و جوار کے علاقوں میں مختلف سامانِ تجارت لاتے تھے۔ روایاتِ سیرت مہاجرینِ حبشہ کی تجارتی سرگرمیوں اور ان کی شاہی محافظت و مراعات کے بارے میں خاموش ہیں، لیکن دوسرے سماجی شواہد اور دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ مہاجرینِ حبشہ کی اتنی بڑی تعداد مدتوں تک محض مراحم خسروانہ پر زندہ نہیں رہی تھی۔ اول تو حکومتی وظائف کھانے کپڑے ہی کا مستقل بار نہ سنبھال سکتے تھے، تو دوسرے اخراجات و ضروریات کے لیے کیا سامانِ کفالت کرتے۔ دوسرے تمام مہاجرینِ حبشہ قریشی اشراف خاندانوں کے جوان و خود دار افراد تھے اور اپنی مکی زندگی میں تجارت و کاروبار میں مقام بنا چکے تھے۔ لہٰذا قیاس کہتا ہے کہ وہ اپنی مہاجرت کے زمانے میں اپنی ضروریات کی تکمیل کاروبار و تجارت سے کرتے تھے اور ملکی تجارت میں حصہ لیتے تھے۔ اس پر ابھی تحقیق باقی ہے، مگر ہجرتِ مدینہ کے بعد مہاجرینِ مکہ انصار کے بے مثال ایثار کے بعد جس طرح تجارت و کاروبار کرنے لگے تھے، اسی طرح وہ ہجرتِ حبشہ کے قیام کے زمانے میں بھی ضرور کرتے رہے ہوں گے۔ اس قیاس کو تقویت اس سے ملتی ہے کہ متعدد مہاجرینِ حبشہ نے بعد میں ہجرتِ مدینہ کرکے دوہری مہاجرت کا تجربہ اور اجر و ثواب حاصل کیا تھا، وہ کسی طرح اپنے معاشی معاملے سے روگردانی نہ کر سکتے تھے کہ وہ ان کے خون میں شامل تھا۔ ان میں حضرت عثمان بن عفان اموی، عبدالرحمن بن عوف زہری، زبیر بن عوام اسدی، ابوحذیفہ بن عتبہ عبشمی، ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی، عثمان بن مظعون جمحی، عمرو و خالد فرزندانِ سعید بن العاص اموی رضی اللہ عنہم جیسے تجربہ کار اور مکی دور میں مسلمہ تجارِ قریش تھے اور دوسروں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ ان کے علاوہ متعدد حضرات و خواتین صنعت و دست کاری کے پیشہ سے وابستہ رہے تھے اور متعدد مہاجرین کا مشغلہ مزدوری کا رہا تھا۔ قوی امکان ہے، بلکہ قریب قریب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ مہاجرینِ حبشہ نے حصولِ معاش کے روایتی طریقے اپنائے تھے اور حکومت نے ان کو مراعات دی تھیں۔ ۸؎

تحفظِ مہاجرین کا تسلسل

روایاتِ سیرت و تاریخ اور احادیث و آثار کا اتفاق ہے کہ مہاجرینِ حبشہ کی ایک بڑی تعداد وہاں آباد و مقیم رہی۔ اگرچہ اکابرِ مکہ کے اسلام لانے کی خبر سن کر ایک بڑی تعداد مکہ مکرمہ لوٹ آئی تھی اور وہاں سماجی تحفظ کے نظام کے تحت بعض سرداروں کے تحفظ و جوار میں اپنے اپنے گھروں اور خاندانوں میں رہنے لگی تھی۔ مہاجرین کی بقیہ تعداد واپس حبشہ چلی گئی اور شاہ نجاشی نے ان کو وہی تحفظ فراہم کر دیا۔ بعد کے واقعات و روایات اور شاہ نجاشی کے عادلانہ اور خسروانہ طریق سے یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان مہاجرین کی آمد و رفت میں حکومتِ وقت نے مالی یا مادی امداد فراہم کی تھی، جیسے مہاجرینِ حبشہ کے آخری انخلا کے وقت نجاشی نے کشتیوں کا انتظام کیا تھا۔ حبشہ واپس جا کر دوبارہ بسنے والے مہاجرین کی تعداد تیس چالیس کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ یہ لوگ وہاں قریب قریب دس بارہ سال مزید مقیم رہے اور ان کے بال بچے پیدا ہوئے، جنھوں نے سماجِ حبشہ میں پرورش پائی۔ اس میں تعلیم و تربیت اور دوسرے سماجی معاملات بھی شامل تھے۔۹؎

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور ان کے ساتھ اشعری اور دوسی مہاجرین کا ایک نیا دستہ حالات کے ہاتھوں حبشہ جا پہنچا۔ طوفانی ہوائیں ان کی کشتیوں کو مدینہ منورہ لے جانے کے بجائے حبشہ کے ساحل پر لے گئیں، حالاں کہ وہ ہجرتِ نبوی کی خبر سن کر مدینہ کے قصد سے نکلے تھے۔ ان کی تعداد کافی تھی۔ بخاری وغیرہ کی روایات کے مطابق حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمیؓ کے مشورے پر وہ حبشہ میں ہی مقیم رہے کہ ان کے لیے یہی اذنِ نبوی تھا۔ ابن اسحاق وغیرہ نے مکی مہاجرین کے بقیہ افراد کی آخری واپسی کے واقعہ میں چونتیس (۳۴) افراد کے اسماء گرامی خاندان وار گنائے ہیں ۱۰؎، لیکن ان کے ساتھ نہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے ساتھ اشعری اور دوسی مہاجرین حبشہ کی واپسی بیان کی ہے، نہ ان کے نام لیے ہیں اور نہ ان کی تعداد ذکر کی ہے۔ دوسری روایات اور شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان یمنی مہاجرین حبشہ کی تعداد ایک سو کے قریب یا اس

سے کچھ زیادہ تھی۔ ہجرتِ نبوی کے بعد کم از کم ڈیڑھ سو مہاجرینِ حبشہ کی حفاظت و کفالت اور سرپرستی و وکالت کا منصفانہ کارنامہ نجاشی نے انجام دیا تھا۔۱۱؎ اسی کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قاصدِ خاص حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ اور ان کے قافلہ و وفد کی مہمان داری اور ضیافت بھی وہ کرتے رہے تھے۔ مکی اور مدنی دونوں ادوار میں قاصدینِ نبوی اور دوسرے اسلامی وفود کا مرکزِ نبوت سے حبشہ جانا ایک مسلّمہ امر ہے اور ان کا دورانیہ بھی خاصا تھا۔۱۲؎ اس پورے دور میں حضرت نجاشیؓ نے اور ان کے بعد ان کے جانشین نے پورے تحفظ و حمایت اور کفالت و سرپرستی کا شان دار کارنامہ انجام دیا تھا۔

اشاعتِ اسلام کی مساعی

بحث کا دوسرا حصہ حبشہ میں حضرت نجاشیؓ کی اشاعت و تبلیغ دین کی مساعی پر مشتمل ہے، جو ایک طویل مدت تک جاری رہا۔ یہ سنہ ۵-۶ نبوی/ ۶۱۵-۶۱۶ء میں ہجرتِ حبشہ کے آغاز سے سنہ ۷ھ/ ۶۲۹ء میں تمام قریشی اور یمنی مہاجرین کی مدینہ واپسی تک تقریباً تیرہ چودہ برسوں کا عرصہ ہے۔ یہ کوششیں نجاشی کے فرزند و جانشین نے بھی بعد میں جاری رکھیں۔ ان کے کئی پہلو اور جہات ہیں اور ان سب کے اثرات و نتائج بھی کافی موثر و نتیجہ خیز رہے تھے۔ ان کا ذکر آئندہ سطور میں ایک منطقی ترتیب سے کیا جاتا ہے۔

اسلامِ نجاشیؓ

روایاتِ سیرت و تاریخ اور آثار و احادیث نبوی سے ثابت ہے کہ معاصر اولین نجاشی حضرت اصحمہ بن ابجرؓ نے دربار میں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی تقریر اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام سننے کے بعد نہ صرف آپؐ کی تصدیق کی تھی، بلکہ اسلام بھی قبول کرلیا تھا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے اسلام کو چھپایا تھا، تاکہ ان کے مذہبی رہ نما (بطارقة) اور دوسرے امراء ہنگامہ نہ کھڑا کر دیں، جب کہ بعض دوسری روایات و احادیث سے حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ حضرت نجاشی اولؓ نے سفیرانِ نبوی کے ذریعہ اپنے خطوط و پیغامات میں اور مہاجرینِ حبشہ کے واسطہ

سے بھی اپنے اسلام قبول کرنے کا ذکر کیا تھا اور خدمتِ نبوی میں اس کا اقرار و اظہار کرنے کا ولولہ دکھایا تھا۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت نجاشیؓ نے امورِ مملکت اور حکم رانی کی مکروہات میں مبتلا ہونے کے سبب بارگاہِ نبوی میں حاضری سے معذرت کی تھی، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی عرض بھیجی تھی کہ حکم ہو تو سب کچھ تج کر کے حاضرِ خدمت ہو کر قدم بوسی کروں، تاکہ اسلام کے اثبات کے ساتھ شرفِ صحبت بھی مل جائے۔ رسول اکرم ﷺ نے ان کے اظہارِ ایمان، اقرارِ اسلام، تصدیقِ رسالت، محافظتِ مہاجرین اور کفالتِ پناہ گزین کو کافی سمجھا، ان کو مکہ مکرمہ یا مدینہ آنے کی اجازت یا اذن نہیں دیا کہ اس کے بغیر ہی ان کا سچ ثابت تھا اور حبشہ کی فرماں روائی اور حکومت پر ان کا قبضہ عظیم اسلامی مصالح کا ضامن تھا۔ ان کے حبشہ سے مرکزِ نبوت میں آ بسنے سے بہت سے فوائد و ثمرات سے محرومی ہوجاتی۔ حضرت نجاشیؓ نے اپنی وصیت میں بھی اپنے اسلام لانے کا اعلان و اقرار کیا تھا اور اسے اپنے سینۂ صدق و صفا پر چسپاں کرلیا تھا۔ ان ہی اسباب اور شواہد کی وجہ سے رسولِ اکرم ﷺ نے ان کی وفات کی خبر سن کر ان کی غائبانہ نمازِ جنازہ صحابہ کے ساتھ پڑھی تھی۔ حضرت اصحمہ بن ابجرؓ کے انتقال کے بعد ان کے جانشین نجاشی حضرت ابونیز رعبداللہ بہ حیثیت مسلم تاج دارِ حبشہ حکومت کرتے رہے اور مطیعِ مرکز رہے۔ ۱۳؎

مکی دور کے وفودِ حبشہ

بعثتِ محمدی کا واقعہ اہل کتاب میں یہود و نصاریٰ دونوں کے لیے رسول آخرالزماں ﷺ کی آمد مبارک کی بشارتِ انبیاء کے وعدۂ ربانی کا ایفاء تھا۔ ان کی کتبِ سماوی (تورات و انجیل وغیرہ) میں اوصافِ محمدی ہی نہیں، خصائص وصفاتِ صحابۂ کرام بھی بیان کی گئی تھیں۔ نصاریٰ خاص طور سے رسول آخرالزماں ﷺ کی آمد و ظہور کے منتظر تھے کہ ان کے رسول معظم حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد احمد ﷺ کی نبوت و رسالت کی بشارت دی تھی۔ روایاتِ سیرت و حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کی خبر جلد ہی عام ہوگئی تھی۔ مکہ مکرمہ، یثرب وغیرہ کے نصاریٰ اور ان کے

احبار وعلماء نہ صرف اس خبر و واقعہ سے واقف ہو چکے تھے، بلکہ کئی نے آپ کی تصدیق بھی کی تھی۔ ۱۴؎ بعض روایات میں ہے کہ بعثتِ نبوی کے اولین عرصہ میں ہی حبشہ کے نصاریٰ کو رسولِ اکرم ﷺ کی نبوت کی خبر مل گئی تھی اور ان کا ایک بیس نفری وفد تحقیقِ احوال اور زیارت و ملاقات کے لیے ہجرتِ حبشہ سے قبل مکہ آیا اور مسجد حرام میں آں حضرت ﷺ سے ملا۔ ان کے علماء اور صاحبانِ فکر و دانش نے سلام و کلام اور تعارفی بات چیت کے بعد متعدد دینی امور پر بحث و مذاکرہ کیا۔ آپؐ نے ان کے سوالات کے جوابات دیے، ان کو قرآنی آیات سنائیں، چنانچہ وہ آپ کی حقانیت سے مطمئن ہو گئے اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ دوسری روایات اور ان پر اہل علم کی تحقیقات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حبشہ کے نصاریٰ کا اولین وفد آپؐ کی خدمت میں ہجرتِ حبشہ کے بعد آیا تھا۔ بہر حال اس کا بھی امکان ہے کہ ایسے دو وفود مکہ مکرمہ کے زمانے میں آئے ہوں کہ واقعات کے تعدّد کا امکان بہ قول محدثین ہمیشہ رہتا ہے۔ تمام اختلافاتِ روایات سے قطعِ نظر یہ حقیقت مسلّم ہے کہ بہ ہر کیف مکی دور میں حبشہ کے نصاریٰ کی ایک جماعت نے دستِ نبوی پر اسلام قبول کیا تھا۔ ۱۵؎ ابن اسحاق نے اس وفدِ نصاریٰ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور ان کے ضمن میں سورۂ قصص کی آیاتِ کریمہ: ۵۲-۵۵ کے نزول کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے نصاریٰ کے اس وفد کے بارے میں یہ خیال کہ وہ نجران سے آیا تھا، غلط قرار دیا ہے اور اس کو 'یُقال' کے صیغۂ تضعیف سے نقل کیا ہے۔ انھوں نے مزید بیان کیا ہے کہ مسجد حرام کے صحن میں اکابرِ قریش کی مجالس میں ان کے حاضرین بھی اس واقعہ کے شاہد تھے اور سخت مضطرب بھی۔ ابوجہل مخزومی حسبِ فطرت برداشت نہ کر سکا تو وفد کے ارکان سے الجھ پڑا اور ان کو سخت سرزنش کی کہ تمہارا وفد بدترین ہے، اللہ تمھیں غارت کرے، تمہارے لوگوں نے تم کو بھیجا تھا کہ اس شخص کے بارے میں خبر لے کر آؤ، لیکن تم اس کی مجلس میں بیٹھے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ دیا اور اس کا دین قبول کر کے تصدیق بھی کی۔ ارکانِ وفد نے صبر و ثبات سے جواب دیا کہ ''سلام علیکم، ہم آپ سے اپنی بات پر جہالت بھری بحث نہیں کریں گے، آپ کا موقف آپ کے ساتھ اور

ہم نے جو صحیح سمجھا اسے اختیار کرلیا''۔ دوسرے سیرت نگاروں نے بھی اس وفد اور اس کے قبول اسلام کے واقعات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔۱۶؎

مدنی دور کے وفودِ حبشہ

سیرت نگاروں اور مورخوں نے مدنی عہد نبوی میں صرف ایک اور حبشی وفد کی آمد اور زیارتِ نبوی کا ذکر کیا ہے۔ روایات کے مطابق یہ وفد ستّر (۷۰) افراد پر مشتمل تھا اور حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمیؓ کے زیر قیادت مہاجرینِ حبشہ کے آخری حصہ کی وطن واپسی پر ساتھ آیا تھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہ سب قدیم مسلمان تھے، یعنی بارگاہِ رسالت میں حاضری سے قبل اپنے ملک میں ہی اسلام لا چکے تھے۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ مدینہ میں زیارتِ نبوی کے موقعہ پر آپ کے دستِ مبارک پر اسلام لائے۔ ان دونوں روایات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔۱۷؎ واقعہ تو یہ تھا کہ وہ تمام حبشی افراد پہلے اسلام لا چکے تھے۔ مدینہ حاضری پر انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ کے دست مبارک پر بیعتِ اسلام کی۔ یہ تطبیق کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ واقعاتِ قبولِ اسلام کا ایک خاص فطری، نفسیاتی اور سماجی رجحان ہے، جو بار بار نظر آتا ہے۔ عرب بدوی قبائل کے افراد کا معاملہ ہو یا خاص مکہ و مدینہ کے افراد کا یا دوسرے دیار و امصار کے افراد وطبقات کا، وہ اسلام تو دعاۃ ومبلغین کی دعوت پر لاتے تھے اور اپنے اپنے علاقوں میں اسلامی تعلیمات کے خوگر اور عامل بن جاتے تھے۔ ان کی عقیدت وشیفتگی بعد میں موقعہ ملتے ہی کشاں کشاں بارگاہِ رسالت میں لے جاتی اور وہ آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔ اہلِ سیرت اسے اسلام لانے سے تعبیر کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک دستِ نبوی پر اسلام لانا شاید مزید شرف کا نام تھا۔۱۸؎

دوسرے وفود میں ایک کا حوالہ اسد الغابہ میں ملتا ہے کہ غزوۂ بدر کی فتح کے بعد نجاشی اور حبشی امت مسلمہ کو خوشی ہوئی۔ بعض دوسری روایات میں ہے کہ بدر کی فتح کی خوش خبری نجاشیؓ نے اپنے لوگوں کے ساتھ مہاجرینِ حبشہ کو سنائی تھی۔ بہرحال

اسدالغابہ کے مطابق مسلمانانِ حبشہ کے ایک گروہ نے نجاشیؓ سے اجازت مانگی کہ وہ زیارتِ نبوی کے لیے مدینہ جائیں۔ اجازت ملی اور وہ مرکزِ اسلام حاضر ہوئے۔ وہ وقت غزوۂ احد کا تھا۔ انھوں نے اذنِ نبوی سے غزوۂ احد میں شرکت کی سعادت پائی۔ ایسے اور بھی وفود ہوسکتے ہیں اور اگر واقعات و روایات ان کی تصدیق نہیں کرتے تو بہرحال اس حقیقت کی تائید تو کرتے ہی ہیں کہ مکی اور مدنی دونوں ادوار میں حبشی امتِ اسلامی کی تشکیل وتعمیر میں مہاجرینِ حبشہ، ان کے اپنے مبلغین اور نجاشیؓ کی دعوت وتبلیغ کا خاصا گہرا اثر پڑا تھا اور ان کے سبب سے وقتاً فوقتاً حبشی افراد وطبقات اسلام لاتے رہے تھے۔ ان کا ذکرِ خیر تراجمِ صحابہ کی کتابوں میں ملتا ہے، جسے مولانا مجیب اللہ ندویؒ نے اپنی کتاب میں جمع کردیا ہے۔ ان کے تجزیہ سے اسلام کی اشاعت کا ایک مرقع بنایا جاسکتا ہے۔۱۹؎

حضرت عمرو بن العاص سہمیؓ کا قبولِ اسلام

قریشی قائدین کے صفِ اول کے سالار، سیاست وسفارت کے اعلیٰ جان کار اور قوم وملت کے مردِ حکیم تھے حضرت عمرو بن العاص سہمیؓ، جو مختلف اسباب سے اسلام کے مخالف اور رسولِ اکرم ﷺ کے دشمن تھے اور غزوات میں مقابلہ آرائی کرتے رہے۔ مکی دور میں ان کی مخالفتِ اسلام میں سیاست وسفارت کاری اور حکمت ودانش کا مظاہرہ ان قریشی وفود میں ہوا جو مہاجرینِ حبشہ کو کسی طرح نجاشی کے عادلانہ نظام سے نکال کر قریشی مظالم کی چکی میں پیسنے کے لیے اپنی قوم کے معاند اکابر کے ساتھ کرتے رہے تھے۔ غزواتِ بدر واحد وخندق میں اپنی فوجی ناکامیوں اور رسولِ اکرم ﷺ کی قائدانہ کامیابیوں سے وہ اسی طرح دل برداشتہ ہوئے تھے جس طرح حبشہ میں اپنی سفارت کاریوں کے انجام سے۔ اس کے باوجود وہ اسلام کے بارے میں اپنی فکر ودانش کا رخ صحیح نہیں کرسکے۔ صلح حدیبیہ کے معاہدہ نے ان کو مزید شکستہ خاطر کردیا، لہٰذا وہ گوشۂ عزلت میں جابیٹھے اور یہ ان کی ناکام سیاست کا ایک نشان بن گیا۔ اس گوشہ تنہائی اور

تفکر وتدبر میں ان کو ایک خیال سوجھا کہ وہ اپنی قوم کے ساتھ حبشہ جا بسیں، تا کہ محمد ﷺ کے تسلّط وغلبہ کے سبب وہ حمایت وحفاظتِ نجاشی کی بنا پر محفوظ و مامون رہیں۔ اس زمانے میں بھی ان کو اسلام کا غلبہ تو نظر آ رہا تھا، لیکن اس کو قبول کرنا منظور نہ تھا۔

قومی وخاندانی حمایت وتائید سے حضرت عمرو بن عاص سہمیؓ دربارِ نجاشی میں اس وقت پہنچے جب رسولِ اکرم ﷺ کے سفیر خاص حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ اپنے سفارتی وفد کے ساتھ موجود تھے، تا کہ بقیہ مہاجرینِ حبشہ کو واپس مرکز اسلام لے جاسکیں اور رسولِ اکرم ﷺ کا نکاح حضرت ام حبیبہ بنت ابوسفیان اموی رضی اللہ عنہما سے کرا کے ان کو بہ طور ام المومنین رخصت کرا کے مدینہ پہنچائیں۔ ۲۰ھ دربارِ عام میں حضرت نجاشیؓ کو سفیرِ نبوی سے محوِ کلام دیکھا تو ان کے دماغ میں مخالفتِ اسلام اور عنادِ رسول کا کیڑا پھر کلبلایا۔ انھوں نے اپنے رفقاء خاص کی تائید وحمایت سے سفیرِ نبوی کو قتل کر کے قریش کا دل ٹھنڈا کرنے کا منصوبہ بنایا اور دربار خاص اور بارگاہ خلوت میں حضرت نجاشیؓ سے اپنی قدیم دوستی اور دیرینہ تعلقات کی وجہ سے جسارت کی اور سفیرِ نبوی کو برائے قتل مانگ لینے کی درخواست کر ڈالی۔ نجاشیؓ اس جسارتِ بے جا پر اتنے غضب ناک ہو گئے کہ ان کے چہرہ پر مکّا مار کر ان کی ناک لہولہان کر دی اور ان کو سخت شرم سار کیا۔ نجاشیؓ نے ان کی عقل وفہم سے اپیل کی کہ رسول اللہ ﷺ کے سفیر کو طلب کرتے ہو؟ حالاں کہ وہ سچے رسول ہیں اور ان کے پاس وہی ناموسِ اکبر آتا ہے جو حضرات موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوا کرتا ہے۔ ابھی تک تمہاری فراست اس حقیقت کو نہ پا سکی؟ عالمِ شرمندگی میں ان کے قلب ونظر سے بغض وعناد کے پردے اٹھ گئے اور وہ سمجھ گئے کہ اس حق کلی کو تمام عرب وعجم نے جان لیا ہے اور نجاشیؓ نہ صرف معرفتِ حق سے سرفراز ہیں، بلکہ سچے رسول پر ایمان بھی لا چکے ہیں۔ معرفتِ حق کا جلوہ دیکھتے ہی انھوں نے حضرت نجاشیؓ سے رسالتِ محمدی کی تصدیق چاہی تو وہ فوراً ملی اور اسی کے ساتھ ان کے قلب وروح میں اسلام سما گیا۔ انھوں نے شاہ حبشہ سے اسلام اور رسالت محمدی پر بیعت لینے کی درخواست کی، جو فوراً قبول ہوئی اور حضرت عمرو بن العاص مسلمان ہو گئے۔

دربارِ خاص میں حضرت عمرو بن العاص سہمیؓ کو خلعتِ شاہی سے نوازا گیا۔ روایت کا اصرار ہے کہ وہ ان کے لباس کے خون آلود ہونے کے سبب بہ طور عطیہ ملا تھا، جب کہ شاہ نجاشیؓ کا عطیہ دراصل ان کے اسلام کے خلعتِ خاص سے سرفراز کرنے کا تھا اور وہ نو مسلم کا حق بھی تھا۔ حضرت عمرو بن العاص سہمیؓ کے دل میں صرف ایک دھن سوار تھی کہ کسی صورت میں وہ سیدھے بارگاہِ نبوی میں پہنچ جائیں۔ باہر نکل کر انھوں نے رفقائے وفد سے ضروری کام کا بہانہ بنایا اور سیدھے ساحلِ سمندر پر کشتیوں کے اڈے پر پہنچے اور ایک کشتی میں سوار ہوکر روانہ ہوئے۔ شعیبہ کی بندرگاہ پر اترے، اونٹ کی سواری کی اور مرالظہر ان سے ہوتے ہوئے مقام ہدہ پہنچے تو دیگر قریشی قائدین و منصب دار حضرات خالد بن ولید مخزومی اور عثمان بن طلحہ عبدری رضی اللہ عنہما سے ملاقات ہوگئی، جو اسلام لانے کے لیے مدینہ جارہے تھے۔ یہ ان کے ساتھ ہوگئے۔ یہ قافلۂ ہدایت بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوا اور آپؐ کے دست مبارک پر اسلام لایا۔ یہ حضرات خالد وعثمان رضی اللہ عنہما کا اولین قبولِ اسلام تھا اور حضرت عمرو سہمیؓ کا تائیدی، کہ اسلام تو انھوں نے حضرت نجاشیؓ کے دستِ حق پرست پر قبول کیا تھا اور اسے اپنے رفقاء اور زمانے سے مخفی رکھا تھا۔

اوائل سنہ ۷ھ/۶۲۹ء میں حضرت نجاشیؓ کے ہاتھ پر ایک عظیم قائدِ قریش اور مدبرِ قوم کا اسلام لانا ایک سادہ واقعہ نہیں ہے، بلکہ وہ متعدد دینی اور سماجی جہات اور حکمتیں رکھتا ہے، جن سے بالعموم بحث نہیں کی جاتی۔ امامانِ سیرت و تاریخ ابن اسحاق و واقدی کی متفقہ روایت اور بعد کے دوسرے اہل سیرت و تاریخ کی تائیدی روایات سے ان کا ایک اندازہ ہوتا ہے:

اول یہ کہ حضرت عمرو بن العاص سہمیؓ اپنی تمام مخالفِ اسلام سرگرمیوں، خاص کر غزوات میں ناکامیوں کے سبب اسلام کے بارے میں سوچنے لگے تھے، خاص طور سے عظیم ترین اکابر قریش کے منظر سے ہٹنے کے بعد کہ ان کے بہ قول ان کی قیادت کی سطوت اتنی تھی کہ اپنی فکر و دانش سے کام نہ لے سکے۔

دوم: ان کے منظر سے روپوش ہونے کے بعد ان کو غور و فکر کا موقعہ ملا اور یہ

احساس پختہ تر ہوتا گیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہر حال غالب آ کر رہیں گے۔

سوم: وہ تسلّطِ محمدی اور غلبۂ اسلام سے بچنے کے راستے ڈھونڈتے رہے اور دین و ایمان اور حقانیتِ محمدی کو سمجھنے کے باوجود جذبہ کو دباتے رہے۔

چہارم: حضرت نجاشیؓ کے ہاتھوں مار کھانے کے بعد ذلت و رسوائی کے شدید احساس نے ان کی مصنوعی حکمت و فراست کے پرخچے اڑا دیے۔

پنجم: یہ کہ حضرت ورقہ بن نوفل اسدی کی طرح حضرت نجاشیؓ کی تصدیقِ نبوتِ محمدی نے ان سے کفر کے پردے چاک کر کے ان کو داخلِ اسلام کر دیا۔

حواشی و مراجع

۱۔ ملاحظہ کیجیے کتابِ خاک سار: 'مکی اسوۂ نبوی۔مسلم اقلیتوں کے مسائل کا حل'، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی ۲۰۰۵ء کا تیسرا باب

۲۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجیے: شبلی (سیرۃ النبی)، ادریس کاندھلوی (سیرۃ المصطفیٰ)، عبدالرؤف دانا پوری (اصح السیر)، سید ابوالاعلیٰ مودودی (سیرت سرور عالم)، صفی الرحمن مبارک پوری (الرحیق المختوم)، سید فضل الرحمن (ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، سید معین الحق (سیرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حکیم محمود احمد ظفر (سیرت خاتم النبیین) کی کتابوں میں ہجرت حبشہ کا باب۔

۳۔ سیرت نبوی پر خاک سار کی کتب و مقالات کی فہرست اس کی بیش تر کتابوں کے آخر میں دے دی گئی ہے۔

۴۔ ابن اسحاق / ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، حمدی طباعت، مکتبۃ المورد، قاہرہ ۲۰۰۶ئ، ۱/ ۲۰۴ ومابعد ؛ سہیلی، الروض الانف، مرتبہ عبدالوکیل، قاہرہ، غیر مورخہ، ۳/ ۲۰۳۔۲۱۵ ومابعد؛ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر بیروت، ۱۹۵۷ئ، ۱/ ۲۰۳۔۲۰۸؛ ابن سیدالناس، عیون الاثر، قاہرہ ۱۹۲۷ئ، ۱/ ۱۵۱۔۱۵۸؛ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، مصر ۱۹۳۲ئ، ۳/ ۶۶۔۷۹؛ نیز بخاری / فتح الباری: ۷/ ۲۳۵۔۲۳۸ ومابعد؛ بلاذری، انساب الاشراف، قاہرہ ۱۹۵۹ئ، ۱/ ۱۹۸۔۲۰۵

۵۔ افراد و شخصیات اور بلاد و امصار کے بارے میں رسولِ اکرم ﷺ کے حکمت آمیز و دور بیں تبصرے اور بیانات دو مستقل تحقیقی موضوعات بن سکتے ہیں اور خاک سار راقم کے پیشِ نظر بھی ہیں۔

۶۔ ابن اسحاق/ ابن ہشام، سہیلی، بخاری، فتح الباری وغیرہ کے مباحث ہجرتِ حبشہ میں واردروایات کا تجزیہ راقم نے اپنی کتاب 'مکی اسوۂ نبوی' میں کیا ہے۔ نجاشی کے نام نامۂ نبوی کا ذکر ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے طبری کے حوالے سے کیا ہے۔

۷۔ ابن ہشام، ۲/ ۳۶۰-۳۶۱؛ سہیلی، ۳/ ۲۴۸ وغیرہ؛ فتح الباری، ۷/ ۲۳۷-۲۳۸ اور ۶۰۵-۶۰۸؛ ابن کثیر ۳/ ۷۰-۷۱؛ مودودی، ۲/ ۵۹۲ و مابعد بحوالہ ابن عساکر و طبرانی۔

۸۔ ابن ہشام، ۱/ ۳۵۷؛ سہیلی، ۳/ ۲۴۴؛ مودودی، ۲/ ۵۶۹؛ مکی اسوہ نبوی، ۱۲۰-۱۲۲

۹۔ ابن اسحاق/ ابن ہشام، ۳/ ۲۲۹-۲۳۵ وغیرہ؛ مکی اسوہ نبوی، حوالہ سابق

۱۰۔ ابن اسحاق کے علاوہ بلاذری میں قریشی مہاجرین کی تعداد چالیس بیان کی گئی ہے۔ فتح الباری، ۷/ ۶۰۷ میں اس پر مزید بحث ہے۔

۱۱۔ حدیث بخاری (۴۲۳۰) میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے مطابق ان کی قوم کے بضع و خمسین (پچاس سے زائد) ثلاثة و خمسین (ترپن) یا اثنین و خمسین (باون) افراد کی تعداد تھی۔ کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر؛ فتح الباری، ۷/ ۶۰۵-۶۰۷ و مابعد وغیرہ۔ بحث حافظ ابن حجر میں پچاس اشعریوں کے علاوہ چھ افراد قبیلہ/ خاندان عک کے بھی ان کے ساتھ تھے، جو حافظ ابن مندہ کی اس روایتِ بخاری کا دوسرا طرف ہے اور جسے امام ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس کی تطبیق کی ہے۔ اصل روایتِ بخاری میں مردوں (رجال) کی تعداد ہے اور ان میں بالعموم عورتوں اور بچوں کو شامل نہیں کیا جاتا، جیسا کہ عرب راویوں، سیرت نگاروں اور محدثین کرام کا عام طریقہ ہے۔ ابن سعد، ۲/ ۱۶۸۔ وفد الاشعریین میں پچاس اشعری اور صرف دو عکی مرد ان کار (رجال) کا ذکر ہے۔ ایسے اختلافات اور بھی ہیں، جن پر بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔

۱۲۔ حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ کے ایک سے زیادہ وفود لے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ وہ

مکی دور سے مدنی دور تک کئی بار فرامینِ نبوی در بارِ نجاشی میں لے گئے تھے۔ ظہور احمد اظہر، حوالہ بالا، ۱۸۶ وما بعد اور ۱۹۰ و مابعد میں ان کے وفود پر بحث ہے اور دوسرے معاملات پر بھی، خاص کر حضرت نجاشیؓ کی خاطر مدارات اور تحفظ و مراعات پر۔ لیکن اس پر کافی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۳؎ مکی اسوۂ نبوی، ۱۲۸-۱۳۱، جس کے مآخذ یہ ہیں:

ابن کثیر، ۳/ ۷۰: ''فأنا أشهد أنه رسول الله وأنه الذی بشّر به عیسیٰ، ولو لا ما أنا فیه من الملک لآتیه حتی أقبّل نعلیه''، ۳/ ۷۲، بہ روایت حافظ ابونعیم؛ ۳/ ۷۷ میں ان کی وصیت کی دستاویز کے لیے۔ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب موت النجاشی؛ فتح الباری، ۷/ ۲۴۰-۲۴۱؛ کتاب الجنائز، مختلف ابواب، مسلم، کتاب الجنائز؛ نیز ابن ہشام، ۱/ ۳۶۱ ومابعد؛ سہیلی، ۳/ ۳۴۸-۲۵۲ وغیرہ۔ نیز ظہور احمد اظہر کے دو ابواب ۴۲-۸۷۔

۱۴؎ قرآن مجید کی متعدد مکی اور مدنی آیات کریمہ میں انبیاء کرام کی بشارتیں اور ان کی کتابوں اور صحف میں آپ کا ذکر خیر ملتا ہے۔ جیسے سورۂ فتح کی آخری آیت: ''مُحَمَّد رَّسُولُ اللّٰہ الخ؛ سورۂ صف: ۶ میں بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام: ''وَمُبَشِّراً بِرَسُولٍ یَّاتِی مِن بَعدِی اسمُه أحمَد''؛ سورۂ اعراف: ۱۵۷: ''۔۔۔ یَجِدُونَه مَکتُوباً عِندَهُم فِی التَّورَاةِ وَالانجِیل الخ وغیرہ۔ ابن اسحاق/ ابن ہشام، ۱/ ۱۵۳: صفۃ رسول اللہ ﷺ من الانجیل؛ نیز اس کے بعد کا باب، ۱/ ۱۵۴، جو انبیاء سے میثاق الٰہی کا ذکر کرتا ہے۔ حضرت ورقہ بن نوفل اسدیؓ کی تصدیق رسالتِ محمدی ایک مصدّقہ واقعہ ہے۔ دوسرے 'احناف' میں سے بھی بعض نے اس کی تصدیق کی۔ حضرت ورقہؓ کے اسفارِ تلاشِ حق اور متعدد احبار و علماء سے ملاقاتیں اور دوسرے احناف کے اسفار بھی بعثت کی خبر پھیلانے کا باعث بنے تھے۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے قبولِ اسلام کے ضمن میں متعدد عیسائی علماء اور رہبان نے آپؐ کی آمد کی بشارت دی تھی اور اسی کی وجہ سے حضرت سلمان فارسیؓ نے عرب کا رخ کیا تھا کہ اسی کے ایک مقام موعود پر رسول آخر الزماں کا ظہور ہوگا۔ ابن ہشام، ۱/ ۱۵۶-۱۵۷؛ اور

اسلام سلمانؓ کے لیے، ۱/ ۱۴۲ وما بعد، بخاری/ فتح الباری، کتاب مناقب الانصار۔

۱۵؎ ابن اسحاق/ ابن ہشام، ۲/ ۲۶-۲۷ نے بیس نفر یا اس کے قریب کا ذکر کیا ہے اور بعض دوسرے مآخذ میں ساٹھ کی تعداد بھی ہے۔

۱۶؎ حوالہ سابق؛ ابن کثیر، ۳/ ۷۱-۹۰؛ مکی اسوہ نبوی، ۱۳۱ وما بعد؛ ظہور احمد اظہر، ۱۶۲-۱۶۹، بہ حوالہ ابن ہشام، ابن کثیر، سیر اعلام النبلاء اور زرقانی وغیرہ۔ موصوف نے حسب معمول اس بحث میں بھی دوسرے امورِ سیرت اور واقعاتِ تاریخ سے بحث کی ہے، جو ان کے جوش ایمانی اور خروشِ ادب کی عکاس ہے۔

۱۷؎ ابن اسحاق/ ابن ہشام؛ ابن سعد، ۴/ ۱۷۳۔ ابوموسیٰ الاشعریؓ کے بارے میں صراحت کی ہے کہ وہ مکہ میں اسلام لائے، پھر ارضِ حبشہ کو ہجرت کی اور پھر دو کشتیوں والوں کے ساتھ خیبر میں خدمت میں حاضر ہوئے۔ دوسری روایت میں وضاحت ہے کہ وہ مکہ میں اسلام لانے کے بعد اپنے وطن میں کام کرتے رہے، پھر وہاں سے حبشہ پہنچے۔ اشعریوں کی تعداد ۵۵ تھی؛ ۴/ ۷۷۳۔ ان کے ساتھ دوسی حضرات بھی تھے۔

۱۸؎ بدوی قبائل عرب میں مقامی مبلغین کرام اور داعیوں کے ہاتھ پر قبولِ اسلام کا ایک درخشاں سلسلہ ہے اور اس کے بعد چمکتے ستارے ہیں: حضرت ابوہریرہ دوسیؓ، حضرت عمرو بن طفیل دوسیؓ کے خاندان والے، حضرت اشج عبدالقیسیؓ اور ان کے برادر زادے۔ بحث کے لیے ملاحظہ ہو کتاب خاک سار 'عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت'، طبع دہلی ۱۹۸۵ء کا باب دوم۔

۱۹؎ مجیب اللہ ندوی، اہل کتاب صحابہ وتابعین، مطبع معارف اعظم گڑھ، ص ۲ و مابعد اور حاشیہ: ۱-۲؛ مکی اسوۂ نبوی، حوالہ سابق۔

۲۰؎ ابن اسحاق/ ابن ہشام اور واقدی کی دو روایات بابت اسلام حضرات ثلاثہ میں رسولِ اکرم ﷺ کے ایک نامہ گرامی کا ذکر ہے۔ ابن سعد (۴/ ۴۴۴) نے لکھا ہے کہ حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ کے بہ دست دو نامے بھیجے گئے تھے، جن میں الگ الگ دو مضامین تھے۔ حضرت عمرو ضمریؓ جنگِ احد کے بعد فوراً اسلام لائے تھے۔ انھوں نے خلافت معاویہ میں وفات پائی۔

☆☆☆

اعلانِ ملکیت سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، فارم: ۴، رول: ۹

۱۔مقام اشاعت: نبی نگر، (جمال پور) علی گڑھ

۲۔نوعیت اشاعت: سہ ماہی

۳۔ پرنٹر پبلشر: سید جلال الدین عمری

۴۔قومیت: ہندوستانی

پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵

۵۔ ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری،

پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵

۶۔ملکیت: ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی،

نبی نگر، (جمال پور) علی گڑھ

بنیادی ارکان کے اسمائے گرامی

۱۔مولانا سید جلال الدین عمری (صدر)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵

۲۔ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی (سکریٹری)

سی ۹، ڈوپلکس کوارٹرس، سول لائنس، علی گڑھ

۳۔ڈاکٹر محمد رفعت (خازن)

شعبۂ فزکس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۴۔ پروفیسر صدیق حسن (رکن)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵

۵۔جناب محمد جعفر (رکن)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵

۶۔مولانا محمد فاروق خاں (رکن)

۱۳۵۳۔بازار چتلی قبر، دہلی۔۶

۷۔جناب ٹی، کے، عبداللہ (رکن)

مالاتھن کنڈی ہاؤس، بلیری، کالی کٹ

۸۔ جناب نصرت علی (رکن)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵

۹۔ ڈاکٹر احمد سجاد (رکن)

طارق منزل، بریاتو ہاؤسنگ کالونی، رانچی

۱۰۔انجینیر سید سعادت اللہ حسینی (رکن)

حیدرآباد

۱۱۔ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی (رکن)

اقرا کالونی، سرسید نگر، علی گڑھ

مندرجہ بالا معلومات میرے علم ویقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔

پبلشر

سید جلال الدین عمری

شہریت کا مسئلہ۔ اسلامی نقطۂ نظر

مولانا اختر امام عادل قاسمی

شہریت کا مسئلہ عہد حاضر کے جدید ترین مسائل میں ہے، جس پر مختلف جہتوں سے کئی دہائیوں سے گفتگو ہورہی ہے۔ یہ مسئلہ انسان کی شناخت کا اولین ذریعہ بن گیا ہے۔ مذہب اور رنگ ونسل کی بنیادیں آج ثانوی درجہ میں چلی گئی ہیں۔ گویا یہ عہد کے لحاظ سے معیار کی تبدیلی ہے۔ پہلے انسان کی پہچان اس کے افکار وخیالات اور مذہبی تصورات سے ہوتی تھی، ان کے علاوہ رنگ ونسل اور زبان بھی امتیاز کا معیار بنتے تھے۔ لوگ جغرافیائی بنیادوں پر اتنا یقین نہیں رکھتے تھے اور نہ ان پابندیوں کے قائل تھے، بلکہ زمین کے ہر خطہ کو ہر فکر ونظر اور ہر رنگ ونسل کے لیے آزاد سمجھا جاتا تھا۔

یورپ میں جب مغربی اقوام کو غلبہ حاصل ہوا اور لادینی رجحانات کا فروغ ہوا تو ان کے اثرات یورپ کے زیرنگیں تمام علاقوں میں پہنچے، خواہ وہ ان کی قدیم آبادیاں ہوں یا نوآبادیات۔ اس کے نتیجے میں وطنیت کا نیا بُت تراشا گیا اور اس کی بنیاد پر انسانوں کو تقسیم کیا گیا، مذہب اور خون کے رشتوں کو کاٹا گیا، ایک علاقہ میں رہنے والے تمام لوگوں کو، خواہ وہ کسی رنگ ونسل کے ہوں اور کسی بھی فکر ونظر اور مذہب وملت کے حامل ہوں، ایک قوم قرار دیا گیا۔ اسی تصور کی بنیاد پر ملکوں کی سرحدی پابندیاں شروع ہوئیں، آمدورفت اور بود وباش کی سہولتیں محدود کی گئیں اور اس کے لیے نئے قواعد وضوابط وضع کیے گئے۔ یورپ کے عالمی قوت بن جانے کے بعد ان اصولوں کو بھی عالمی حیثیت دی گئی اور تمام ممالک کے لیے ان کی پابندی لازم کردی گئی۔

اس دور میں کچھ نئی اصطلاحات وضع کی گئیں، جن میں سے ایک شہریت کی

اصطلاح بھی ہے۔عربی میں اب اس کے لیے 'جنسیت' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جو قومیت (Nalionalily) کا مترادف ہے۔یعنی اب نئے معیار کے مطابق قوم مذہب یا رنگ ونسل سے نہیں، بلکہ وطن سے بنتی ہے،اس لیے اس کی جنس اسی ملک کی طرف منسوب ہوگی۔عالمی سیاست پر مغرب کی بالادستی سے قبل ان اصطلاحات کا وجود نہیں تھا۔پہلے اس کے لیے عربی زبان میں 'وطنیت' یا 'توطن' کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔اردو میں شہریت کی اصطلاح بڑی حد تک وطنیت سے قریب ہے،لیکن مفہوم میں بڑا فرق ہے۔اب شہریت کا استعمال 'جنسیت' کے معنیٰ میں ہوتا ہے۔وطنیت کے لفظ میں بڑی وسعت ہے۔عارضی اقامت گاہوں کے لیے بھی وطن کا لفظ استعمال کیا جاسکتا تھا۔البتہ دونوں میں فرق کرنے کے لیے مستقل اقامت گاہوں کو 'وطن اصلی' یا 'وطن قرار' کہا جاتا تھا اور عارضی اقامت گاہوں کو وطن اقامت، وطن سکونت یا وطن مستعار کہا جاتا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ جس معنیٰ میں آج شہریت کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، وہ بڑی حد تک صرف 'وطن اصلی' یا 'وطن قرار' میں پایا جاتا ہے۔اس کی روشنی میں شہریت کے معنیٰ ومفہوم کو سمجھا جاسکتا ہے۔

شہریت کی اصطلاحی تعریف اور اقسام

شہریت موجودہ اصطلاح میں فرد اور حکومت کے درمیان اس مخصوص سیاسی اور قانونی رابطہ کا نام ہے جس کی بنیاد پر کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے بعض تقاضوں اور واجبات کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔یہ وہ قانونی رشتہ ہے جس کی بنیاد پر ایک فرد کا وجود اور تشخص اس ریاست کی طرف منسوب ہوتا ہے جہاں کا وہ شہری ہے۔ مثلاً ہندوستانی، امریکی، برطانوی اور سعودی وغیرہ۔پھر شہریت کی بھی دو قسمیں ہیں : (۱) پیدائشی شہریت :یعنی کسی ملک میں پیدائش کی بنیاد پر بلا اختیار بچہ کو شہریت حاصل ہوجائے۔(۲) اختیاری شہریت: یعنی وہ شہریت جو سعی وارادہ سے حاصل کی جائے، مثلاً اس ملک کی کسی لڑکی یا لڑکے سے شادی کرلی جائے، یا حکومت سے درخواست کرکے شہریت حاصل کی جائے، وغیرہ۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نئے ملک کی شہریت حاصل

ہونے کے بعد سابقہ ملک کی شہریت منسوخ ہوجاتی ہے، مثلاً ہندوستان کا کوئی شخص برطانوی شہریت حاصل کرلے تو اس کی ہندوستانی شہریت ختم ہوجائے گی۔ اور کبھی یہ بھی ممکن ہے کہ نئے ملک کی شہریت حاصل ہونے کے بعد سابقہ ملک کی شہریت برقرار رہے، مثلاً پاکستان کا کوئی شخص برطانوی شہریت حاصل کرے تو اسے دونوں جگہوں کی شہریت برقرار رکھنے کا حق حاصل رہتا ہے۔ یہ مختلف ملکوں کے اپنے اپنے معاہدات کی روشنی میں طے پاتا ہے کہ کس ملک کے شہری کے ساتھ کیا معاملہ روا رکھا جائے؟

پھر جب کوئی شخص کسی ملک کا شہری بن جاتا ہے تو اس کو وہ تمام حقوق ومراعات حاصل ہوجاتے ہیں جو ایک پیدائشی شہری کو حاصل ہوتی ہیں اور وہ تمام ضمانتیں مل جاتی ہیں، جو بحیثیت شہری کے ملنی چاہئیں۔ اسی کے ساتھ اس پر بعض واجبات اور مطالبات بھی عائد ہوتے ہیں، جن کی تکمیل بہ حیثیت فرد اس کو کرنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ہر شہری کو ملنے والے حقوق درج ذیل ہیں:

- اسے اپنے ملک میں مستقل قیام کا حق حاصل ہے۔
- وہ ملک کے تمام وسائل سے بلا امتیاز استفادہ کرسکتا ہے۔
- وہ اپنی صلاحیت سے ملک کے کسی بھی عہدہ اور منصب تک پہنچ سکتا ہے، کوئی بھی ملازمت حاصل کرسکتا ہے، کسی بھی قسم کی تجارت کرسکتا ہے۔
- اسے اپنے ملک میں ہر طرح کی آزادی حاصل ہوگی۔
- اس کی جان ومال اور عزت ووقار کو تحفظ فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، وغیرہ۔

اسی طرح اس پر شہری کی حیثیت سے درج ذیل واجبات عائد ہوتے ہیں:

- ملکی آئین کے ساتھ اس کی وفاداری ضروری ہے۔
- وہ ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ لے۔
- ملکی مفادات کے تحفظ کے لیے ہر طرح کی خدمت وقربانی کے لیے تیار رہے وغیرہ۔

شہریت کے اصول اور بنیادیں

اسلام میں شہریت کے اصول وضوابط کیا ہیں؟ اور اس کے لیے کن چیزوں کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے؟ قرآن وسنت میں اس ضمن میں کوئی تصریح نہیں ملتی اور نہ فقہاء کے یہاں کوئی صراحت موجود ہے۔ البتہ وطن کی تفصیلات کے ضمن میں بعض چیزوں کا تذکرہ ہوا ہے، جن سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سلسلے کے مباحث فقہ شافعی اور فقہ حنبلی میں موجود نہیں ہیں۔ فقہاء مالکیہ کے یہاں بھی یہ بحث اجمال کے ساتھ آئی ہے، البتہ فقہاء حنفیہ کے یہاں نسبتاً زیادہ تفصیل ملتی ہے۔ اکثر علماء حنفیہ نے اس موضوع سے تعرض کیا ہے۔ ان تفصیلات سے زیر بحث مسئلے میں فی الجملہ تین بنیادیں ابھر کر آتی ہیں، جن کو شہریت کے مسئلے میں مدار بنایا جاسکتا ہے:

(۱) ولادت: یعنی وہاں اس کی پیدائش ہوئی ہو۔

(۲) نکاح: یعنی وہاں کے کسی شخص سے زوجیت کا رشتہ قائم ہوا ہو۔

(۳) مستقل بود وباش کا ارادہ، خواہ ملازمت اور ذریعۂ معاش کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے۔

علامہ محمود بن مازہ بخاری شہیدؒ (م ۶۱۶ھ) لکھتے ہیں:

وطن أصلي وهو مولدالرجل والبلد الذى تأهّل به۔۱

کسی شخص کا وطن اصلی وہ ہے جہاں وہ پیدا ہوا ہو یا اس نے وہاں شادی کی ہو۔

علامہ کاسانیؒ رقم طراز ہیں:

أو بلدة اخرىٰ اتخذها دارًا وتوطّن بها مع أهله وولده وليس من قصده الارتحال عنها بل التعيش بها۔۲

کسی شخص کا وطن وہ مقام بھی ہے جہاں پر اس نے اپنا گھر بنالیا ہو اور اہل وعیال کے ساتھ وہاں مستقل رہتا ہو اور وہاں سے کہیں اور جانے کا ارادہ نہ ہو۔

بعض فقہاء مالکیہ نے بھی ان میں سے کچھ چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ محمد بن عبداللہ الخرشیؒ مختصر خلیل کی شرح میں لکھتے ہیں:

الأول الوطن وهو ما اتّخذ فيه الإقامة بنية التأبيد۳؎

وطن وہ ہے جہاں اس نے ہمیشہ کی نیت سے قیام کا ارادہ کرلیا ہو۔

والوطن في الثانية هو المسافر بقرية فيها أهلهٗ وولدهٗ فأقام عندهم ولو صلاة واحدة أتمّ ... ومن كتاب ابن المواز وإذالم تكن مسكنهٗ ولكنهٗ نكح بها فلايتمّ حتى يبنى بأهلهٖ ويلزمهٗ السكنىٰ۔ ۴؎

وطن سے مراد ایسی بستی کا سفر ہے جہاں اس کے اہل وعیال رہتے ہوں، وہاں ایک نماز کے برابر بھی قیام کرے گا تو اس پر اتمام ضروری ہے،.....اور اگر اس کا وہ مسکن نہ ہو، لیکن اس نے نکاح کیا ہو تو پوری نماز اس وقت پڑھے گا جب کہ اپنی بیوی کے ساتھ وہیں زفاف گزارے اور سکونت لازم ہے۔

فقہاء کے اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وطنیت کے حصول کے لیے یہ تینوں بنیادیں مستقل حیثیت رکھتی ہیں، یعنی ان میں سے کوئی ایک بنیاد بھی موجود ہو تو شہریت حاصل ہوجائے گی۔ اسی لیے اگر کسی کو دو جداگانہ مقامات پر ان میں سے کوئی ایک چیز حاصل ہو تو اسے دوہری شہریت حاصل ہوگی اور دونوں جگہیں اس کے لیے وطن کا درجہ رکھیں گی۔ المحیط البرہانی میں ہے:

وان كان لهٗ أهل ببلدةٍ فاستحدث ببلدةٍ أخرىٰ أهلاً فكل واحدٍمنهما وطن أصلي،وروى انهٗ كان لعثمان رضی اللہ عنہ أهل بمكة وأهل بالمدينة وكان يتمّ الصلوٰة بهما جميعاً۔ ۵؎

اگر کسی کے اہل وعیال ایک شہر میں ہوں، پھر دوسرے شہر میں اس نے شادی کرلی تو دونوں شہروں کی شہریت اسے حاصل ہوگی۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی ایک بیوی مکہ معظّمہ میں رہتی تھیں اور دوسری مدینہ منورہ میں چنانچہ وہ دونوں جگہ نماز پوری پڑھتے تھے۔

اسی طرح فقہاء نے مستامن کی بحث میں یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم دارالاسلام میں وقتی قیام کی غرض سے داخل ہو، لیکن پھر مستقل قیام کا ارادہ کرلے، یا (علیٰ اختلاف الاقوال) طویل مدت تک قیام کرے، یا وہاں کے کسی متوطن سے رشتۂ ازدواج

قائم کرلے ، یا وہاں کی کوئی خراجی زمین خرید لے تو اسے دارالاسلام کی شہریت حاصل ہوجائے گی اور وہ مستامن باقی نہیں رہے گا ، نیز اگر وہ اہل وعیال کے ساتھ ہے تو اس کے ساتھ وہ بھی اہل ذمہ (یعنی اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری) قرار پائیں گے۔٦ ؎

یہ بات اگرچہ غیر مسلموں کے تعلق سے کہی گئی ہے، مگر فی الجملہ اس کو شہریت کے حصول کے معاملے میں بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

شہریت کے نئے قواعد بنائے جاسکتے ہیں

فقہاء نے مذکورہ جن چیزوں کا ذکر کیا ہے، وہ بہ ظاہر حصر کے لیے نہیں ہیں، بلکہ یہ اس دور کی چند معروف صورتوں کا تذکرہ ہے، کیوں کہ یہ چیزیں منصوص نہیں، بلکہ اجتہادی ہیں، جن میں عرف وعادت اور مشاہدہ وتجربہ کا دخل ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کسی ملک کا قانون شہریت کے لیے کچھ نئی بنیادیں وضع کرے ، یا مذکورہ چیزوں میں ترمیم کرے یا کچھ شرطوں کا اضافہ کرے تو اس کی گنجائش محسوس ہوتی ہے، بشرطے کہ اس کا مقصد ملک وملت کی سلامتی اور شہریوں کا تحفظ ہو، اس لیے کہ عرف وعادت میں تغیر ممکن ہے اور ملکی قانون میں تبدیلی تغیرِ عرف کی علامت قرار دی جائے گی۔

مسلم ملک میں کسی بیرونی مسلمان کو شہریت دینے کا مسئلہ

اس ضمن میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا کسی مسلم ملک کے لیے ہر ایسی درخواست شہریت کی تعمیل ضروری ہے جو کسی دوسرے ملک کے مسلم امیدوار کی جانب سے پیش کی جائے ؟

اس معاملہ میں اسلام کا اصل مزاج، جو قرآن وحدیث کی نصوص سے سمجھ میں آتا ہے، یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومت کو ایسے تمام مسلم امیدواروں کے لیے توسع کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ کئی نصوص سے اس پر روشنی پڑتی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ أَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْأَرْضِ قَالُوْٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَأُولٰٓئِكَ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۔ (النسائ:۹۷)

بے شک ان لوگوں کی جان، جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا ہے، (جب) فرشتے قبض کرتے ہیں تو ان سے کہیں گے کہ تم کس کام میں تھے؟ وہ بولیں گے: ہم اس ملک میں بے بس تھے۔ فرشتے کہیں گے: اللہ کی سرزمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟

اس آیتِ کریمہ میں جہاں ایسی سرزمین میں اقامت کو جرم قرار دیا گیا ہے جہاں نظامِ طاغوت کی حکم رانی ہو، وہیں اسلامی حکومتوں کو یہ اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ اللہ کی زمین اللہ کے نام پر آنے والوں کے لیے تنگ نہیں کی جانی چاہئے، بلکہ مہاجرین کے لیے وہاں ہمیشہ گنجائش رہنی چاہئے، اس لیے کہ ہجرت کے حکم سے قبل مقامِ ہجرت کا وجود شرط ہے۔ اس کے بغیر حکمِ ہجرت کی کوئی معنویت باقی نہیں رہتی۔ مہاجرین کے لیے حالات کے تحت حکم میں فرق ہوسکتا ہے، مگر ایک خالص اسلامی ریاست کو اس حکم کی تعمیل میں ہر وقت لچک رکھنی ہوگی۔

اسی طرح قرآن کریم میں ہجرت کر کے مدینہ آنے والی خواتین کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا إِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِإِيْمَانِهِنَّ فَإِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ۔ (الممتحنۃ:۱۰)

اے ایمان والو! تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کا جائزہ لو، اللہ ان کے ایمان کو زیادہ جانتا ہے اگر وہ تمہیں مومن معلوم ہوں تو ان کو کافروں کے پاس مت لوٹاؤ۔

دراصل یہ حکم ایک خاص پس منظر میں دیا گیا تھا۔ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر اہل مکہ کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رُو سے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آنے والے مسلمانوں کو مدینہ کی سکونت نہیں دی جاسکتی تھی، بلکہ ان کو مکہ واپس کرنا ضروری تھا۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص مدینہ سے مکہ چلا جاتا، تو اہل مکہ پر ان کو لوٹانا ضروری نہیں تھا۔

یہ معاہدہ اگرچہ مردوں اور عورتوں سب کے لیے بہ ظاہر یکساں تھا، لیکن عملاً عورتوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوا، چنانچہ اسلام قبول کرنے کے بعد مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آنے والی خواتین کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس نہیں فرمایا۔

مہاجرین کے مسئلہ پر مسلم ملک کا غیر مسلم ملکوں سے معاہدہ

البتہ اگر اسلامی ریاست غیر مسلم ملکوں سے مہاجرین کے معاملہ میں کوئی معاہدہ کرلے، یا اس قسم کے کسی بین الاقوامی منشور کو منظوری دے، جس کی رؤ سے دوسرے ملکوں کے مہاجرین کو اپنے یہاں مستقل سکونت نہ دے سکتی ہو تو اس صورت میں حکم شرعی کیا ہوگا؟

اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

مالکیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں معاہدہ پر عمل کرتے ہوئے مہاجرین سے شہریت کے معاملے میں معذرت کا جواز ہے، البتہ اسلامی حمیت کے نقطۂ نظر سے خارجی طور پر ان کی مدد کی جائے گی۔[۷]

ان کی دلیل یہ ہے کہ اسلام میں معاہدوں کی پابندی کی بڑی اہمیت ہے، خواہ وہ مسلمانوں سے کیے جائیں یا غیر مسلموں سے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَأَوْفُواْ بِعَهْدِ اللّهِ إِذَا عَاهَدتُّمْ وَلاَ تَنقُضُواْ الأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلاً إِنَّ اللّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ (النحل:۹۱)

جب معاہدہ کرو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو، اور قسمیں موکد کرنے کے بعد نہ توڑو، جب کہ تم نے اللہ کو اپنے اوپر کفیل بنالیا ہے۔ جو تم کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے۔

ایک روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابوطفیلؓ روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے حضرت حذیفہ بن الیمانؓ نے بیان کیا کہ غزوۂ بدر میں میری شرکت اس لیے نہیں ہوسکی تھی کہ میں اور میرے والد حسیل مکہ سے نکلے تو کفارِ قریش نے ہمیں پکڑ لیا کہ تم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ ہم نے کہا: نہیں، ہم صرف مدینہ جانا چاہتے ہیں تو ان لوگوں

نے ہم سے اللہ کے نام پر ہم سے عہد و پیمان لیا کہ ہم سیدھے مدینہ جائیں اور آپؐ کے ساتھ جنگ میں شرکت نہ کریں۔ لیکن ہم سیدھے رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے، (آپ بدر میں تھے) اور سارا ماجرا سنایا۔ آپؐ نے فرمایا:

انصرفا، نفی لھم بعھدھم و نستعین اللہ علیھم ۸؎	تم دونوں مدینہ واپس جاؤ، ہم ان کے عہد کو پورا کریں گے اور اللہ سے ان کے خلاف مدد چاہیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد جو طرز عمل اختیار فرمایا اس سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ آپؐ نے اس وقت کے حالات کے مطابق یک طرفہ طور پر کفار کی شرطوں کو قبول فرمایا، جن میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ ان کے شہر کا کوئی مسلمان ان کی مرضی کے بغیر دارالکفر (مکہ) سے نکل کر دارالاسلام (مدینہ) نہیں جا سکتا۔ آج بھی ویسے حالات پیدا ہو جائیں تو اس کو قانون کے طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے۔

شافعیہ اس طرف گئے ہیں کہ اس طرح کی شرطوں کو قبول کرنا درست نہیں اور نہ آنے والے مسلمانوں کو واپس کرنا جائز ہے، البتہ اگر ان کے اہل خاندان اپنے ملک میں مضبوط اور صاحب اثر و رسوخ ہوں اور انہیں خاندانی حمایت حاصل ہو، جس سے ان کی ابتلا کا اندیشہ کم ہو تو واپس کرنے کی گنجائش ہے۔ بعض شوافع کا خیال ہے کہ جس مسلمان پر ہجرت فرض نہ ہو اس کو واپس کیا جا سکتا ہے۔ ان کے یہاں ایک قول یہ بھی ملتا ہے کہ آزاد شخص کو واپس کرنے کی اجازت ہے، کہ اس صورت میں وہ واپس جانے کے بہ جائے کہیں اور اپنی پناہ گاہ تلاش کر سکتا ہے، جس طرح کہ صلح حدیبیہ کے بعد حضرت ابوبصیرؓ نے کیا تھا، جب اللہ کے رسولؐ نے ان کو واپس کر دیا تھا۔ ۹؎

حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ شرط باطل ہے اور اس طرح کے کسی معاہدہ کو پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔ ۱۰؎

اس کی کئی وجوہ ہیں:

(الف) صلح حدیبیہ کا واقعہ دائمی نہیں، وقتی تھا۔ بعد میں اس کو منسوخ کر دیا گیا۔ قرآن کریم کی یہ آیت اس پر شاہد ہے:

فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ (الممتحنۃ: ۱۰)	ان (عورتوں) کے ایمان کا علم ہو جانے کے بعد ان کو کافروں کے پاس واپس نہ بھیجو۔

یہ اس تاویل پر مبنی ہے کہ معاہدہ کو مردوں اور عورتوں کے لیے عام قرار دیا جائے، جیسا کہ مشہور ہے۔ ۱۱؎

(ب) یہ حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص تھا، اس لیے کہ آپ صاحبِ وحی تھے۔ آپ وحی کے ذریعہ معلوم کر سکتے تھے کہ اس کے نتائج کیا ہونے والے ہیں؟ جیسا کہ حدیبیہ کے بہ ظاہر مغلوبانہ معاہدہ کو قرآن کریم نے فتح مبین قرار دیا۔ یہ ظاہری صورت کے اعتبار سے نہیں، بلکہ نتائج کے اعتبار سے تھا۔ عہدِ نبوت کے بعد اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ واقعات کے نتائج کا پہلے سے علم ہو، اس لیے اب اس کی اجازت نہیں ہو سکتی کہ مسلمان کفر کے مقابلے میں مغلوبانہ پوزیشن اختیار کریں اور حقارت آمیز شرطوں پر معاہدے کریں۔ ۱۲؎

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حنفیہ نے اس طرح کی شرطوں کا انکار دو وجہوں سے کیا ہے: ایک ذلت وحقارت اور دوسرے مسلمان ہونے کی بنا پر ابتلاء وآزمائش۔ لیکن اگر معاہدہ دوطرفہ مساوات پر مبنی ہو اور دارالکفر میں مسلمانوں کے ابتلاء و آزمائش کا اندیشہ نہ ہو، جیسا کہ آج کے دور میں ہے، تو حنفیہ اپنے اس حکم پر اصرار نہیں کریں گے۔ لیکن بعض مراجع سے اندازہ ہوتا ہے کہ واپسی کے معاہدہ پر برابری کی صورت میں بھی وہ راضی نہیں ہیں اور اس شق کو وہ صریح طور پر معاہدہ نامہ سے خارج کیے جانے کے قائل ہیں، یعنی معاہد ملکوں کو صراحت کے ساتھ بتا دیا جائے گا کہ ہم اپنے ملکوں میں ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کو واپس نہیں کریں گے۔ شرح السیر الکبیر میں ہے:

وھذا شرط لاینبغي أن یترک ذکرہٗ في الکتاب لانہٗ اذا أخرج إلینا منھم	معاہدہ نامہ میں اس شرط کا ذکر نہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر کوئی مسلمان

مسلم أوذمی لایجوز لنا أن نردّہٗ علیھم فالظاھر أنھم یطالبوننا بالمناصفة ویقولون: کما لاتردّون أنتم فنحن لانرد، وبعد ذکر ھذا الشرط تنقطع ھذہ المحاجة۔ ۱۳؎

یا ذمی ان کے پاس سے نکل کر ہمارے پاس چلا آئے تو ہمارے لیے ان کو واپس کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ وہ برابری کا مطالبہ کریں گے اور کہیں گے کہ جیسے تم ہمارے آدمی کو نہیں لوٹاتے ہو، ہم بھی نہیں لوٹائیں گے، لیکن صراحتاً اس شرط کے تحریر میں آجانے کے بعد حجت باقی نہیں رہے گی۔

موجودہ دور میں عالمی حالات کافی بدل چکے ہیں۔ سیاسی طور پر مسلمانوں کی وہ پہلی سی شان بھی باقی نہیں رہی اور مسئلہ اختلافی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی شرط کا قبول کرنا قطعی طور پر ثابت ہے، البتہ اس کے نسخ کی نوعیت میں اختلاف ہے۔ اس لیے پیش نظر مسئلہ کو منسوخ ماننے کے بجائے اختلافِ احوال پر محمول کیا سکتا ہے، یعنی عہدِ غلبہ اور عہدِ مغلوبیت کے احکام میں فرق کرنا ہوگا۔ حدیبیہ کا واقعہ اس دور کا ہے جب عرب کی سطح پر مسلمان عہدِ غلبہ میں داخل نہیں ہوئے تھے، ان کا عہدِ غلبہ صحیح معنیٰ میں فتح مکہ کے بعد شروع ہوا۔

مسلم ملک میں مسلمان پناہ گزینوں کا مسئلہ

بعض دفعہ کسی ملک کے مسلمان مجبور ہوکر کسی مسلم ملک سے سیاسی پناہ کی درخواست کرتے ہیں۔ وہ مسلم ملک ان کو سیاسی پناہ دینے پر آمادہ ہوتا ہے، لیکن ان مسلمانوں کو پناہ گزیں کی حیثیت سے رکھا جاتا ہے، انہیں شہری تسلیم نہیں کیا جاتا۔ کیا اس کی شرعاً گنجائش ہے؟

اس کی دو صورتیں ممکن ہیں:

(الف) سیاسی پناہ کے لیے کسی ملک میں اقامت اختیار کرنا عموماً ایک وقتی عمل ہوتا ہے، یعنی اگر پناہ گزیں کے اپنے ملک کے حالات درست ہو گئے تو واپس چلا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ شہریت کے حصول کے لیے مستقل قیام کا ارادہ ضروری ہے، اس

لیے اگر اس بنیاد پر ملک کے عام شہری اور سیاسی پناہ گزینوں میں فرق کیا جاتا ہے تو شرعاً کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔ اس لیے کہ عارضی قیام کرنے والوں کو اس ملک کے اصل باشندوں کا درجہ نہ دیا جائے تو یہ ایک انتظامی عمل ہے اور شریعت میں اس پر کوئی نکیر موجود نہیں ہے۔ اس طرح کے فرق کا ثبوت خود عہدِ نبوت میں ملتا ہے۔ مثلاً مختلف وفود وقتی تعلیم وتربیت کے لیے مدینہ منورہ آتے تھے اور کچھ دن قیام کرکے واپس چلے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ حقوق وواجبات کے معاملے میں ان کو اہل مدینہ کا مقام حاصل نہیں تھا۔ اسی طرح بہت سے وہ لوگ، جو مدینہ سے باہر قیام پذیر تھے، ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فإن أبوا أن يتحوّلوا منها فأخبرهم أنهم يكونون كأعراب المسلمين، يجرى عليهم حكم الله الذى يجرى على المؤمنين، ولا يكون لهم فى الغنيمة والفيء شيء إلا أن يجاهدوا مع المسلمين۔ ۱۴

اگر یہ لوگ دارالہجرۃ میں واپس ہونے پر رضامند نہ ہوں تو ان کو خبردار کردو کہ وہ اعرابی مسلمانوں کے درجے میں ہوں گے اور وہ حکم الٰہی کے اسی طرح پابند ہوں گے جس طرح دیگر مسلمان پابند ہیں، مگر ان کو مال غنیمت اور فئے میں کوئی حصہ نہیں ملے گا جب تک کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شرکت نہ کریں۔

نیز اسلام کا یہ متفقہ اصول ہے کہ:

المغنم بالمغرم فى الاسلام۔ ۱۵

نفع نقصان کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

جو لوگ ملک کے مستقل شہری ہیں ان پر ملک کی بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، مثلاً ان کو خزانۂ مال کے استحکام کے لیے ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے، ملک کے تحفظ کے لیے جان ومال کی قربانی دینی پڑتی ہے وغیرہ، اس لیے بہت سے اضافی حقوق بھی انہی کو مل سکتے ہیں، جو محض سیاسی پناہ کے لیے مقیم حضرات کو نہیں مل سکتے۔

(ب) البتہ اگر سیاسی پناہ حاصل کرنے والے کا قیام وقتی نہ ہو، بلکہ وہ مستقل طور پر اس ملک میں آباد ہوجانے کا ارادہ رکھتا ہو اور سیاسی پناہ کی درخواست محض اس ملک میں داخلہ کا عنوان ہو تو ایسے لوگوں کو مستقل شہریوں کا درجہ حاصل ہونا چاہئے۔ ان

کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھنا درست نہ ہوگا۔ قرآن کریم کا یہ ارشاد اس سلسلے میں بہت واضح ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَهَاجَرُواْ وَجٰهَدُواْ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ آوَواْ وَّنَصَرُواْ أُوْلٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (الانفال: ۷۲)

جولوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اللہ کے لیے اپنی جانی اور مالی صلاحیتیں خرچ کیں اور وہ لوگ جنہوں نے ان کو پناہ دی اور مدد کی، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور ولی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دارالاسلام منتقل ہوجانے والے مسلمانوں کو وہاں کے مقیم مسلمانوں کے مساوی قرار دیا اور ان کو باہم بھائی بھائی بنادیا۔ اسلام میں جغرافیہ اور رنگ ونسل کوئی چیز نہیں ہے، یہ صرف باہم تعارف کے ذرائع ہیں۔ اصل پہچان رشتۂ ایمان ہے۔ اگر کوئی چیز اس کی راہ میں حائل ہوتی ہے تو اس کو ختم کرکے صرف کلمہ کو پہچان کی بنیاد بنائی جائے گی اور کلمہ میں شریک تمام لوگ بھائی بھائی قرار دیے جائیں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

من صلّیٰ صلاتنا و استقبل قبلتنا و أکل ذبیحتنا فهو المسلم، له ما للمسلم، وعلیه ماعلی المسلم۔ ۱۶

جوشخص ہماری طرح نماز پڑھے، ہمارے قبلہ کا رخ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے، وہ مسلمان ہے اور اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں اور اس پر وہ تمام واجبات عائد ہوں گے جو مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں۔

اس کی تائید اس مسئلۂ شرعی سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی مستامن (وقتی امان لے کر آنے والا غیر مسلم) یا ذمی (اسلامی حکومت کا غیر مسلم شہری) اسلام قبول کرلے تو بہ اتفاق فقہاء اس کا عقد ذمہ ختم ہوجاتا ہے اور وہ تمام امتیازات بھی کالعدم ہوجاتے ہیں جو غیر مسلم ہونے کی وجہ سے بہت سی چیزوں میں پیدا ہوتے ہیں اور جملہ حقوق وواجبات میں وہ وہاں کے مسلم شہریوں کے مساوی قرار پاتا ہے۔ ۱۷

البتہ شہریت کی تکمیل کے لیے انتظامی طور پر کچھ قواعد وضوابط وضع کیے جاسکتے

ہیں اور اس کے لیے کوئی مدت یا مراحل مقرر کیے جاسکتے ہیں۔

شہریت سے وابستہ حقوق وواجبات

رہا یہ مسئلہ کہ شہریت کی بنیاد پر کیا کیا حقوق وواجبات عائد ہوتے ہیں؟ یعنی وہ کیا چیزیں ہیں جو بہ طور حق شہریوں کو ملتی ہیں اور بہ طور ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے؟ تو میرے علم ومطالعہ کی حد تک اسلام میں اس کی کوئی تفصیل مقرر نہیں ہے۔ کچھ حقوق بنیادی ہیں اور کچھ احوال وظروف اور زمان ومکان کے تغیرات سے پیدا ہوتے ہیں ،اس لیے ان کی تفصیلات کی تعیین ممکن نہیں۔ جوحقوق وواجبات وہاں کے عرف میں شہریت سے متعلق سمجھے جاتے ہیں،شریعت ان کی نفی نہیں کرتی۔گزشتہ صفحات میں ایک روایت کا حوالہ دیا گیاہے،اس میں عمومیت کے ساتھ یہ الفاظ آئے ہیں:

لہٗ ماللمسلم ، وعلیہ ماعلی المسلم۱۸؎

وہ تمام حقوق جو مسلمانوں کو ملتے ہیں وہ اس کو ملیں گے اور وہ تمام واجبات جو مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں اس پر عائد ہوں گے۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو میثاق تیار فرمایا اس میں بلا امتیاز مذہب وملت داخلی اور خارجی سطح پر جن حقوق وواجبات کی نشان دہی کی گئی تھی،ان سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ حقوق کے باب میں کوئی خاص شکل مقرر نہیں ہے ،بلکہ ان کا تعلق مختلف ملکوں کے اپنے حالات، تقاضوں اور عرف سے ہے۔ اس معاملے میں ہر ملک کی انتظامیہ پوری طرح آزاد ہے کہ کس چیز کو وہ حق قرار دیتی ہے اور کس چیز کو واجبات میں شامل کرتی ہے؟ بس شرط یہ ہے کہ اس تعین کی بنیاد معروف پر ہو،انسانیت کی فلاح پیش نظر ہو،اسلام کی روح اور مقاصد سے ہم آہنگی ہو اور شریعت کی کسی نص سے تصادم نہ ہو۔

مسلمانوں کے لیے غیر مسلم ملکوں کی شہریت حاصل کرنا

اگر کوئی مسلمان ضرورت ومجبوری کی بناپر یا محض معاشی فوائد کی غرض سے کسی

غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہے تو کیا اس کی اجازت ہوگی؟

ہمارے قدیم مراجع میں یہ بحث باضابطہ نہیں ملتی، لیکن عصر حاضر میں یہ مسئلہ علماء کے درمیان زیر بحث رہا ہے۔۱۹؎ راقم الحروف کی کتاب 'غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل' میں اس موضوع پر تفصیلی بحث موجود ہے۔

اس سلسلے میں علماء کے دو نقطۂ نظر سامنے آتے ہیں:

(۱) ایک نقطۂ نظر اس کے ناجائز ہونے کا ہے۔ اس کے قائلین کے دو طبقات ہیں:

(الف) ایک طبقہ اس کو خروج عن الاسلام اور صریح ارتداد کے مترادف قرار دیتا ہے اور جو لوگ غیر مسلم ملکوں میں مقیم ہیں ان پر مرتدین کے احکام جاری کرنے کا قائل ہے۔ اس طبقہ کے مشہور علماء یہ ہیں: شیخ محمد رشید رضا مصری، ۲۰؎ شیخ محمد یوسف الدجوی، شیخ محمد شاکر، (یہ ازہر کے اکابر اہل علم میں سے ہیں) شیخ ادریس شریف محفوظؒ۔ (یہ اپنے وقت میں بیروت کے مفتی تھے) ۲۱؎ اور ڈاکٹر محمد عبدالکریم الجزائری ۲۲؎ وغیرہ۔

(ب) دوسرا طبقہ اس کو ارتداد نہیں کہتا، بلکہ صرف معصیت قرار دیتا ہے۔ اس طبقہ میں شیخ مختار السلامی، رکن مجمع الفقہ الاسلامی اور شیخ محمد عبداللہ بن سبیّل امام وخطیب مسجد حرام وعضو ہیئۃ کبار العلماء سعودی عرب خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ۲۳؎ اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ والافتاء نے بھی یہی فتویٰ جاری کیا ہے۔ ۲۴؎

(۲) دوسری رائے جواز کی ہے، پھر جواز کے قائلین کے بھی دو نقطۂ نظر ہیں:

(الف) ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کی گنجائش صرف بہ وقت ضرورت ہے۔ عرب علماء میں شیخ احمد بن احمد الخلیلی، مفتیٔ عام سلطنت عمان ورکن مجمع الفقہ الاسلامی کی یہی رائے ہے۔ مصری دارالافتاء نے بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔ ۲۵؎

(ب) دوسرا نقطۂ نظر اصلاً جواز کا ہے، البتہ حالات وظروف اور اغراض ومقاصد کے لحاظ سے حکم کی نوعیت میں فرق ہوسکتا ہے۔

عہد حاضر کے جمہور علماء کی رائے یہی ہے۔ اس رائے کے حامل چند مشہور نام یہ ہیں: ڈاکٹر یوسف القرضاویؒ ۲۶؎، ڈاکٹر محمد رافت عثمانی، عمید الکلیۃ الشرعیۃ والقانون،

جامعۃ الازہر، ڈاکٹر وہبہ الزحیلیؒ ۲۷؎ اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی ۲۸؎ وغیرہ۔

قائلین عدم جواز کے دلائل

جو حضرات عدمِ جواز کی رائے رکھتے ہیں ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُواْ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيْدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوٓاْ إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوٓاْ أَن يَكْفُرُواْ بِهِ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلاَلاً بَعِيْداً (النساء:۶۰)

کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں کی، جو دعویٰ رکھتے ہیں کہ وہ اس (کتاب) پر ایمان لے آئے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی ہے اور جو آپ سے قبل نازل ہو چکی ہے، لیکن چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جائیں، حالاں کہ انہیں حکم مل چکا ہے کہ اس کے مقابلے میں کفر اختیار کریں اور شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ انہیں بھٹکا کر بہت دور دراز لے جائے۔

طاغوت سے مراد وہ نظامِ قانون ہے جو اسلامی شریعت کے خلاف ہو۔ غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا گویا بہ اختیار خود اسلامی نظامِ قانون سے نکل کر طاغوتی نظام قانون میں داخل ہونا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلام سے انحراف کے مترادف ہے۔ ۲۹؎

(۲) ایک مقام پر قرآن نے مومن اور غیر مومن کے درمیان امتیاز کا معیار یہ بیان کیا ہے:

فَلاَ وَرَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُواْ فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُواْ تَسْلِيْماً (النساء:۶۵)

پس آپ کے پروردگار کی قسم، یہ لوگ ایمان دار نہ ہوں گے، جب تک کہ اس جھگڑے میں، جو ان کے آپس میں ہوں، آپ کو حکم نہ بنالیں اور پھر جو فیصلہ آپ کر دیں اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو پورا پورا تسلیم کریں۔

اس آیت کریمہ کے تحت ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ ''اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص اللہ یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کسی امر کو رد کردے، وہ خارج از اسلام ہے، خواہ شک کی بنیاد پر رد کرے یا اس کو بالقصد قبول کرنے سے انکار کردے۔'' ۳۰ ے

غیر اسلامی مملکت میں قیام دوسرے الفاظ میں احکام الٰہی کو قبول کرنے سے بالا رادہ گریز ہے۔

(۳) ان حضرات نے بعض ان احادیث سے بھی استدلال کیا ہے، جن میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صراحت کے ساتھ غیر مسلموں کے درمیان اقامت وسکونت سے منع کیا ہے اور ایسے مسلمانوں سے اپنی براءت کا اظہار کیا ہے، جو غیر مسلموں کے درمیان رہائش پذیر ہیں۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

أنا بریٔ من کل مسلم یقیم بین أظهر المشرکین ۳۱ ے

میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان قیام پذیر ہو۔

(۴) ان حضرات نے عقلی طور پر استدلال کیا ہے کہ غیر مسلم ملکوں میں قیام کا مطلب ان ملکوں کے تمام قانونی تقاضوں کی تکمیل ہے، جن میں بہت سی چیزیں خلافِ شرع بھی ہوسکتی ہیں۔ کبھی وہ ملک اپنے شہریوں سے فوجی خدمات کا بھی مطالبہ کرسکتے ہیں اور فوجی ملازمت کے دوران اگر خدانخواستہ کسی اسلامی سلطنت سے جنگ چھڑ جائے تو مسلم فوجیوں کو غیر مسلم فوجیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں بھی حصہ لینا ہوگا۔ ان کے علاوہ اور بھی بعض ایسی صورتیں پیش آسکتی ہیں جن میں خلافِ شرع باتوں پر عمل کرنا پڑے۔ ظاہر ہے کہ ایک مومن کے لیے جائز نہیں کہ وہ جان بوجھ کر دینی طور پر اپنے کو ان شدید خطرات میں مبتلا کرے اور اپنی ہلاکت کا سامان کرے۔

جمہور کے دلائل

لیکن جو علماء جواز کے قائل ہیں، ان کے پیش نظر وہ قرآنی آیات ہیں جن میں اسلام کی آفاقیت اور اس کی دعوت عامہ کا ذکر موجود ہے۔ (مثلاً: التوبۃ: ۳۳،

الانبیائ: ۱۰۷، سبا: ۲۸، النحل: ۱۲۵، یوسف: ۱۰۸ وغیرہ) ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت دنیا کے ہر خطہ میں پہنچانا اس امت کا منصبی فریضہ ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ مسلمان اسلامی ملکوں سے نکل کر غیر مسلم ملکوں میں بھی جائیں اور اسلام کی دعوت چار دانگ عالم میں پہنچائیں۔ اگر وہ اپنے ہی ملکوں میں سمٹ کر رہ جائیں تو اسلام کی دعوت اور اس کے نمونے غیر اسلامی دنیا تک کیسے پہنچیں گے؟ صحابۂ کرام نے دنیا کے سامنے جو عملی مثال پیش کی ہے وہ ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ انہوں نے سخت مشکل حالات میں اپنا وطن چھوڑ کر غیر اسلامی ملکوں کا سفر کیا، وہاں قیام کیا اور اسلام کی دعوت دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچائی۔ انہوں نے دعوت وتبلیغ کے باب میں جغرافیائی امتیاز نہیں رکھا اور زمین کے کسی حصہ کو صرف اس لیے نظر انداز نہیں کیا کہ وہاں غیر اسلامی حکومت قائم ہے۔ اگر صحابہ اپنے آپ کو اسلامی ملکوں تک محدود کر لیتے تو ان کے ذریعہ عالمی دعوت کا وہ کام انجام نہ پاتا جو ان کا امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

قواعدِ فقہ سے رہ نمائی

اس سلسلے میں بعض قواعد فقہیہ سے بھی رہ نمائی ملتی ہے:

(۱) مشہور فقہی قاعدہ ہے کہ زمان ومکان اور حالات کی تبدیلی کی وجہ سے حکم بدل جاتا ہے: **لاینکر تغیر الاحکام بتغیر الازمان۔** ۳۲

جس دور میں بعض عرب علماء نے غیر مسلم ملک کی شہریت کو حرام قرار دیا تھا وہ فرانسیسی استعمار کا دور تھا۔ عرب ممالک بالخصوص تیونس اور الجزائر اس کے زیادہ شکار تھے۔ اس استعمار کا مقصد اسلام کے خلاف منصوبے بنانا، اس کی بنیادوں کو کم زور کرنا، اس کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنا، سچے مسلمانوں پر ظلم وجبر کرنا اور دینی انحراف پھیلانا تھا۔ اس دور میں ظاہر ہے کہ اسلام دشمنوں کے ملکوں میں رہنا اور وہاں کا شہری بننا ایک خطرناک عمل تھا، جو عام مسلمانوں کے لیے نا قابلِ جواز تھا۔ لیکن آج حالات بدل چکے ہیں۔ مذہبی آزادی کا اصول بین الاقوامی طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے۔ اس لیے آج

اس قدیم فتویٰ پر (جو عبوری دور میں دیا گیا تھا) اصرار کرنا مناسب نہیں ہے۔ آج ضرورت ہے کہ حالات کے تغیر کے مطابق فتویٰ میں بھی تبدیلی لائی جائے۔

(۲) مصالح ومفاسد کے درمیان تعارض ہوجائے تو موازنہ کرنا ضروری ہوجاتا ہے اور جو پہلو غالب ہو اس کے مطابق حکم شرعی عائد کیا جاتا ہے۔ یہ اسلام کا بنیادی اصول ہے:

إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضررًا بارتكاب أخفّهما ۳۳؎	جب دو مفسدوں میں تعارض ہوجائے تو بڑی مضرت سے بچنے کی خاطر ہلکے مفسدہ کی اجازت دی جائے گی۔
الأخذ بأعظم المصلحتين ودفع أعظم المفسدتين ۳۴؎	دو مصلحتوں میں سے بڑی مصلحت کو اختیار کیا جائے گا اور دو مفسدوں میں سے بڑے مفسدہ کو دور کیا جائے گا۔

آج کے دور میں کسی غیر اسلامی ملک کی شہریت میں کچھ نقصانات ضرور متوقع ہیں، لیکن ان کی تلافی کی صورتیں بھی موجود ہیں۔ وہاں دینی ادارے قائم کیے جائیں، مدارس ومکاتب بنائے جائیں، مساجد کی تعمیر ہو، علماء ودعاۃ سے رابطہ رکھا جائے تو بڑی حد تک جوارِ کفر کی مضرتوں سے بچا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی مصلحتیں ہیں، جو مسلمانوں کے وہاں قیام کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی ہیں مثلاً:

(الف) غیر مسلم ممالک اپنے شہریوں کو مکمل مذہبی آزادی، فکر وخیال کی آزادی، اظہار رائے کی آزادی اور سیاسی، اقتصادی اور فوجی حقوق دیتے ہیں، جن کے تحت کوئی بھی شخص باعزت زندگی گذار سکتا ہے اور اپنے آئینی حقوق کے ذریعہ وہاں کی حکومت پر بھی اثر انداز ہوسکتا ہے۔

آج غیر مسلم طاقتیں بالخصوص مغربی ممالک جس طرح اسلام اور مسلم ممالک کے خلاف محاذ آرا ہیں یا اس کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد وہاں موجود ہو تو ان کے اس قسم کے فیصلوں پر بہ آسانی اثر انداز ہوسکتے ہیں اور خود حکومتوں کو

بھی مسلمانوں کے خلاف اس قسم کے فیصلوں میں دس بار سوچنا ہوگا کہ اس کے نتائج خود ان ملکوں میں کیا ظاہر ہوں گے؟ اگر مسلمان وہاں نہ ہوں تو یہ بڑا قومی فائدہ اسلام اور ملت اسلامیہ کو حاصل نہیں ہوسکتا۔

(ب) غیر اسلامی ملکوں میں رہ کر مسلمان اپنے وسائل سے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کر سکتے ہیں اور جو علماء، دعاۃ اور مسلمان وہاں پہنچیں ان کے لیے بہتر معاون ومددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر ان ترقی یافتہ غیر مسلم ملکوں میں مسلمان نہ ہوں تو مسلم اقلیتوں کو وہاں کے وسائل سے استفادہ کی صورت کیا ہوگی؟

(۳) فقہ کا ایک مشہور قاعدہ ہے:

مالایتم الواجب إلابہ فھو واجب۳۵۔ جس کے بغیر واجب پورا نہ ہوتا ہو وہ بھی واجب ہے۔

دعوت الی اللہ اس امت کا منصبی فریضہ ہے۔ اس کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ روئے زمین کے تمام باشندوں تک اسلام کی آواز نہ پہنچ جائے اور اس کے عملی نمونے ان کے سامنے نہ آجائیں۔ آج کے دور میں اسلام کی آواز ترقی یافتہ وسائل ابلاغ کے ذریعہ پہنچائی جا سکتی ہے اور انھیں اسلامی تعلیمات سے بھی کسی حد تک روشناس کرایا جا سکتا ہے لیکن عملی نمونے کے لیے مسلمانوں کے ایک طبقہ کا وجود وہاں ضروری ہے، جو غیر مسلموں کے درمیان اسلامی آئیڈیل کا کام دے۔ علاوہ ازیں یہ مسلمان خود بھی اپنے قول وعمل اور اخلاق وکردار سے امتِ غیر مسلمہ میں دعوت کا کام کریں۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ مسلمان غیر مسلم ملکوں کی شہریت حاصل کریں اور وہاں کا حصہ بن جائیں، کیوں کہ غیر ملکیوں کا قول وعمل آج کی دنیا میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔

(۴) فقہ کا ایک اور مشہور قاعدہ ہے:

الضرورات تبیح المحظورات۳۶۔ ضرورت کی بنیاد پر بعض ممنوعات کی اجازت دی جاتی ہے۔

کبھی مسلمانوں کو اپنے ملک کے بعض مسائل کی بنیاد پر ہجرت کی ضرورت

پیش آتی ہے اور موجودہ حالات میں پوری دنیا میں کوئی ایسی اسلامی مملکت نہیں ہے جو پوری وسعت نظری کے ساتھ کسی بیرونی مسلمان کو بہ حیثیت شہری قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو، جب کہ بہت سے غیر مسلم ملکوں میں شہریت کے معاملے میں زیادہ توسّع موجود ہے۔ ان حالات میں بدرجۂ مجبوری مسلمانوں کو غیر مسلم ملکوں میں قیام وشہریت کی اجازت دی جانی چاہئے اور غیر مسلم ملکوں کے توسّع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

راجح مسلک

اس مسئلے پر عدمِ جواز کے قائلین اور مجوّزین کے دلائل کا جائزہ لینے پر موخرالذکر کا مسلک زیادہ مضبوط، قابل قبول اور لائق ترجیح محسوس ہوتا ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں:

(۱) تمام علماء (خواہ وہ جواز کی رائے رکھتے ہوں یا عدم جواز کی) اس بات پر متفق ہیں کہ غیر مسلموں سے تعلقِ خاطر اور مسلم ملکوں کے مقابلے میں غیر مسلم ملکوں کی عظمت واحترام کے جذبہ سے ان کی شہریت حاصل کرنا ناجائز ہے۔ عدمِ جواز کے وہ تمام دلائل جو مانعین پیش کرتے ہیں، ان کی بہ آسانی یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ ان کے درمیان یہی قدرِ مشترک ہے۔

(۲) اگر عدمِ جواز کی رائے علی الاطلاق مان بھی لی جائے تو اس کو استعماری دور پر محمول کیا جائے گا، جب غیر مسلم ملکوں میں کسی صاحبِ ایمان کا داخلہ مشکل سمجھا جاتا تھا اور اس کو ارتداد یا تعاون علی الکفر کے مترادف تصور کیا جاتا تھا۔ آج وہ صورتِ حال باقی نہیں رہی۔ اب مسلمانوں کی بڑی تعداد وہاں مقیم ہے اور بڑے سکون اور آزادی کے ساتھ دینی زندگی گذار رہی ہے۔ وہاں بڑے بڑے دینی مراکز قائم ہیں۔ اسلام کی اشاعت کا کام بھی ہورہا ہے اور مسلمان اپنے نومسلم بھائیوں کی مدد اور ان کی تعلیم وتربیت کا معقول انتظام کرتے ہیں۔ ان مسلمانوں نے اپنی تمام تر توقعات اور صلاحیتیں اسی سرزمین کے لیے مرکوز کردی ہیں اور دوبارہ وطن واپسی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ ان

حالات میں عدمِ جواز کی رائے یقیناً بعد از وقت اور دشوار کن ہے۔

(۳) عدمِ جواز کے قائلین نے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ اپنے مفہوم ومصداق کے اعتبار سے قطعی نہیں ہیں، بلکہ ان میں تاویل کا احتمال موجود ہے۔ مثلاً:

(الف) جن آیات کریمہ کو اس استدلال میں پیش کیا گیا ہے کہ غیر مسلم ملک کی شہریت احکام اسلامی کا بالا رادہ ترک اور کفار کے ساتھ دوستانہ تعلقات کا اظہار ہے، اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ غیر مسلم ملکوں کے جو قوانین اسلامی احکام سے متصادم ہیں، ضروری نہیں کہ مسلمان ان کو من وعن قبول کرلیں، بلکہ ان کو حق ہے (اور ان کو یہ کرنا چاہئے) کہ وہ ان قوانین کے بارے میں اپنے مشترکہ احساسات ایوانِ حکومت تک پہنچائیں، ان کو تبدیل یا ان میں مناسب ترمیم کرانے کی متحدہ جدوجہد کریں اور جب یہ ترمیم منظور ہوجائے تو قانون کی اس لچک سے فائدہ اٹھائیں، مثلاً مرنے کے بعد مورث کے ترکہ کا قانون یوروپی ملکوں میں غیر اسلامی ہے، لیکن اس میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ اگر کوئی فرد مرنے سے پہلے اپنے ورثہ کی تقسیم کے لیے کوئی لائحہ عمل تجویز کردے تو اس کی موت کے بعد ورثہ پر لازم ہوگا کہ وہ اس کے تجویز کردہ طریقۂ کار کے مطابق ترکہ کی تقسیم کریں۔ قانون کی اس شق سے استفادہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو چاہئے کہ مرنے سے قبل یہ وصیت تحریر کرجائیں کہ ان کی موت کے بعد ان کے ترکہ کی تقسیم اسلامی شریعت کے مطابق ہوگی۔ اس طرح ورثاء پر قانونی طور پر لازم ہوجائے گا کہ وہ شریعت کے مطابق ترکہ کی تقسیم کریں۔ اسی طرح ان ملکوں میں نکاح کا رجسٹریشن قانونی طور پر لازم ہے۔ اس کے بغیر نکاح غیر قانونی اور غیر نافذالعمل قرار پاتا ہے۔ اس صورت میں کسی قسم کے مطالبات بھی ثابت نہیں ہوتے۔ چنانچہ اگر کوئی مسلمان اسلامی طور پر نکاح کرے اور اس کا رجسٹریشن بھی کرائے تو یہ قانونی طور پر ممنوع نہیں ہے۔ اس طرح ان غیر مسلم ملکوں میں پائی جانے والی قانونی مشکلات کو حل کیا جاسکتا ہے۔ وہاں کی شہریت حاصل کرنے سے ہرگز لازم نہیں آتا کہ اس شخص نے اپنے دین وایمان کا سودا بھی کرلیا ہے، العیاذ باللہ۔

(ب) بہت سے غیر مسلم ملکوں میں مسلم ممالک کو یہ قانونی اختیار دیا گیا ہے کہ وہاں کا کوئی شخص اگر غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرلے تو یہاں کی شہریت کے ساتھ اپنے ملک کی شہریت بھی باقی رکھ سکتا ہے، یعنی بہ یک وقت وہ دو ملکوں کی شہریت کا حامل ہوسکتا ہے، دو پاسپورٹ رکھ سکتا ہے، اس لیے غیر مسلم ملک کی شہریت سے لازم نہیں آتا کہ وہ اسلامی ریاست اور اس کے نظامِ قانون سے بھی دست بردار ہوگیا ہو۔

(ج) جہاں تک غیر مسلم ملکوں میں عسکری ملازمت کا مسئلہ ہے تو اولاً جو ملک ہر قسم کے مطالبات اور جملہ حقوق فراہم کرتا ہے، اس کے لیے 'الغرم بالغنم' کے اصول پر اس ملازمت کا مطالبہ بے جا نہیں ہے۔ نیز فوجی ملازمت میں اگر کچھ نقصانات ہیں تو فوائد اس سے زیادہ ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آج بڑی طاقتوں کے پاس جو فنونِ حرب اور جنگی صلاحیتیں ہیں، مسلمان فوج کا حصہ بن کر ان سے کافی استفادہ کرسکتے ہیں۔ موجودہ دور میں اس کی بڑی ضرورت ہے، اس لیے کہ بڑی طاقتوں کے مقابلے کے لیے جو ضروری تیاریاں اور جنگی صلاحیتیں ہونی چاہئیں وہ ہماری مسلم افواج اور حکومتوں کے پاس مفقود ہیں، اس لیے غیر مسلم ملکوں میں مقیم مسلمانوں کو اگر ایسے مواقع ہاتھ آتے ہیں تو ان کو ضائع کرنا مناسب نہیں ہے۔ فقہ کا اہم ترین ضابطہ ہے:

المصلحة العامة مقدّمة على المصلحة الخاصة۔ ۳۷ مصلحت عام مصلحت خاص پر مقدم ہوتی ہے۔

دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر غیر مسلم افواج میں مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد موجود ہو تو ان کے لیے مسلم ممالک پر فوج کشی اتنی آسان نہ ہوگی جس قدر آج محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے أخفّ الضررین کے اصول پر عسکری ملازمت کی وجہ سے مسلمانوں کو بددل نہیں ہونا چاہئے۔ علاوہ ازیں فوجی ملازمت سے کنارہ کشی کی وجہ سے ان پر غداری اور دیگر الزامات بھی لگ سکتے ہیں، جو بہ حیثیت قوم سخت نقصان دہ ہیں اور اسلام کی اشاعت کی راہ میں بھی اس سے خلل پڑسکتا ہے، اس لیے 'لاضرر ولاضِرار' کے ضابطہ پر مسلمانوں کو فوجی ملازمت سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔

پھر ہر ملک میں فوجی ملازمت کا جبری اصول نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر ملکوں میں اس معاملے کو انسان کے اپنے اختیار تمیزی پر چھوڑا گیا ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے قیام کے لیے ایسے ملک کا انتخاب کریں جہاں فوج کی جبری ملازمت کا قانون نہیں ہے۔ فوجی ملازمت کی صورت میں بھی مسلمانوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالات میں فوجی مہم میں شرکت سے معذرت کردیں، اس لیے کہ تمام ملکوں نے حرّیتِ ادیان کا اصول تسلیم کرلیا ہے اور فوج میں باقاعدہ مذہبی رہ نما رکھے جاتے ہیں۔ ان کے لیے مساجد اور بنیادی دینی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے، غرض اس طرح کے جتنے شبہات وخطرات پیش کیے جاتے ہیں، ان تمام کا مناسب حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔

ان تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ غیر مسلم ملکوں میں قیام یا وہاں کی شہریت 'شجر ممنوعہ' ہرگز نہیں ہے۔ البتہ مسلمانوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ اگر وہ کسی مسلم ملک میں قیام پذیر ہیں اور وہاں کے حالات ان کے لیے پریشان کن نہیں ہیں تو اپنے ملکوں میں ہی قیام کریں اور اسلامی نظام قانون کے تحت زندگی گذاریں۔ دوسرے ملکوں کا سفر یا قیام عارضی طور پر محض ضرورت کے بہ قدر کریں۔ ان حالات میں غیر مسلم ملکوں میں مستقل قیام یا شہریت کا حصول کراہت سے خالی نہیں ہے۔ البتہ اگر کسی کے لیے ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ مسلم ملکوں میں قیام اس کی پریشانیوں کا باعث ہو اور کسی غیر مسلم ملک میں اس کے لیے بہتر مواقع میسر ہوں تو اس کے لیے غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنے کی گنجائش ہوگی، بہ شرطے کہ:

(۱) وہاں رہ کر اس کا دینی تشخص اور اسلامی وجود مجروح نہ ہو اور مستقبل قریب میں اس کے یا اس کی اولاد یا اس کی عزت ووقار کے لیے دینی اعتبار سے کوئی خطرہ نہ ہو۔

(۲) مسلمان وہاں دین وملت کا صحیح نمائندہ ہو اور اپنے اخلاق وعمل اور خلوص و صداقت سے اسلام کا آئینہ دار ہو، تاکہ اس کے اثرات اس کے غیر مسلم پڑوسیوں پر پڑیں۔

(۳) ترکِ وطن کو وہ ہجرتِ حبشہ کی طرح پاک مقاصد کے لیے اختیار کرے اور اپنے احساسات واعمال کے ذریعہ اس نقل مکانی کو اپنے اور ملت اسلامیہ کے لیے ہر طرح مفید اور بامقصد ثابت کرے۔

معاشی مقاصد کے تحت ترکِ وطن

اس حکم میں معاشی مجبوریوں کے تحت نقل مکانی بھی شامل ہے،:

(الف) بشرطے کہ کسی مسلمان کے اپنے ملک میں اس کی معاش کے ضروری وسائل میسر نہ ہوں، اس کی بنا پر مجبوراً وہ کسی غیر مسلم ملک چلا جائے اور اپنے دینی تشخص کی حفاظت کے ساتھ وہاں کی اقامت یا شہریت اختیار کرے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک اس کی اجازت ہے۔ ۳۸؎

اس لیے کہ کسبِ معاش بھی ایک اہم ترین فریضہ ہے۔ اس کے لیے شریعت نے کسی مکان کی قید نہیں رکھی ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولاً فَامْشُوا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ وَإِلَیْهِ النُّشُورُ (الملک:۱۵)

وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے تابع بنایا۔ پس اس کے کاندھوں پر چلو اور اس کی دی ہوئی رزق استعمال کرو اور اسی کی طرف پھر اٹھایا جانا ہے۔

(ب) البتہ اگر کسی شخص کے اپنے ملک میں اس کے لیے وسائلِ معاش میسر ہوں، لیکن زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی غرض سے وہ کسی غیر اسلامی ملک کی شہریت کا خواہاں ہو تو ظاہر ہے کہ یہ صورت کراہت سے خالی نہیں ہے، اس لیے کہ غیر مسلموں کے عقائد اور تہذیب وکلچر سے بچنا ہر کسی کے لیے آسان نہیں ہے۔ اس کے اثرات اس سے زیادہ اس کے اہل وعیال پر پڑ سکتے ہیں۔ حضرت سمرۃ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من جامع المشرک وسکن معهٗ فإنهٗ مثلهٗ۔ ۳۹؎

جو مشرک کے ساتھ اکٹھا ہو اور سکونت رکھے وہ اسی کی طرح ہے۔

علامہ خطابیؒ (م ۳۸۸ھ) اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وفیه دلالة علیٰ کراهة دخول المسلم دار الحرب للتجارة والمقام فیها أکثر من مدة أربعة أیام۔ ۴۰؎

حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کسی مسلمان کے لیے تجارت کی غرض سے دارالحرب کا سفر کرنا یا وہاں چار دن سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے۔

اس سے یہ رہ نمائی ملتی ہے کہ محض دولت کی ہوس اور زیادہ سے زیادہ امیر بننے کی آرزو میں غیر مسلم ملک کی سکونت وشہریت کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

(ج) اگر کسی شخص کو بنیادی وسائلِ معاش اپنے ملک میں میسر ہوں، جس سے فاقہ کی نوبت تو نہ آتی ہو، مگر وہ اپنی یا اپنے خاندان کی اقتصادی پوزیشن بہتر کرنے کے لیے کسی غیر مسلم ملک میں اقامت وسکونت اختیار کرنا چاہیے، اس صورت میں صرف عارضی قیام وسکونت کی گنجائش نظر آتی ہے، جیسا کہ بعض علماء نے اس کی صراحت کی ہے۔ ۴۱؎ لیکن مستقل سکونت اور باقاعدہ شہریت کی اجازت دینا اس صورت میں بہت مشکل ہے۔

(د) تجارتی مقاصد کے تحت غیر مسلم ملکوں کا سفر اور وہاں قیام کی جمہور علماء کے نزدیک اجازت ہے، لیکن یہ بھی وقتی قیام کی حد تک ہے۔ ۴۲؎

امام مالکؒ اور علامہ ابن حزمؒ کو وقتی قیام سے بھی اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک علی الاطلاق دنیوی اغراض کے لیے غیر اسلامی ملک میں قیام کرنا جائز نہیں ہے۔ ۴۳؎

دراصل جمہور فقہاء کے پیش نظر عہد نبوی کے بعض واقعات ہیں، جن میں بعض صحابہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے مختلف اغراض کے تحت غیر مسلم ملکوں میں اقامت اختیار کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکیر نہیں فرمائی۔ اس لیے کہ ان کے لیے دینی فتنہ کا اندیشہ نہیں تھا، یا یہ کہ ان کا وہاں قیام کرنا زیادہ مفید تھا، مثلاً حضرت عباسؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے مدینہ ہجرت نہیں کی اور مکہ میں رہتے ہوئے اپنے اسلام پر قائم رہے۔ ۴۴؎ اسی طرح نجاشی نے بھی قبولِ اسلام کے بعد مدینہ ہجرت نہیں کی اور اپنی غیر اسلامی مملکت میں مقیم رہے۔ ۴۵؎

بالخصوص آج کے دور میں مسلم ممالک تجارت وصنعت کے میدان میں جس قدر پس ماندہ ہیں، اس کا تقاضا ہے کہ مسلم تجار ترقی یافتہ غیر مسلم ملکوں کا دورہ کریں، وہاں قیام کریں اور اعلیٰ صنعتوں سے روشناس ہوں۔ یوں بھی تجارتی بنیادوں پر متعلقہ افراد کی آمدورفت اور اشیاء کا تبادلہ اس دور میں ملک کی ترقی کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ تجارت اگر پوری دیانت داری اور خلوص کے ساتھ اسلامی

اصولوں کے مطابق کی جائے تو غیر مسلم برادری پر اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اچھے اثرات پڑیں گے۔ اس سے دعوت کی راہ کھلنے کے بڑے امکانات ہیں۔ ماضی میں تجارت ہی کے عنوان سے ہمارے اسلامی قافلوں نے مختلف ملکوں کا سفر کیا اور انہی قافلوں کے ذریعہ اسلام دنیا کے مختلف علاقوں میں پہنچا۔ اس لیے تجارت آج کے دور میں دعوت کا بہترین وسیلہ ہے۔ اس وسیلہ کو کھو دینا ہرگز دانش مندی نہیں ہوگی۔

ظاہر ہے کہ یہ ضرورت وقتی قیام سے بھی پوری ہوسکتی ہے۔ اس کے لیے مستقل شہریت کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص تجارت کو محض وسیلۂ دعوت کے طور پر اختیار کرے تو اس کے لیے بلاشبہ غیر مسلم ملکوں کی شہریت نہ صرف جائز، بلکہ باعث فضیلت ہوگی۔

مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو شہریت دینا

ایک سوال یہ ہے کہ کیا مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا؟

یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ فقہاء نے اس مسئلہ کو بہت پہلے صاف کر دیا ہے۔ ہماری تمام فقہی کتابوں میں 'اہل ذمہ' کا باقاعدہ باب قائم کیا گیا ہے اور ان سے متعلق احکام کی پوری تفصیل موجود ہے۔ ذمی ہر ایسے غیر مسلم کو کہتے ہیں جس کو حکومت (اور حنفیہ کے نزدیک کسی بھی مسلمان) کی طرف سے جزیہ اور اسلام کے شہری قوانین کی پابندی کی شرط پر ملک میں دائمی طور پر رہنے کی اجازت دی گئی ہو اور حکومت کی طرف سے اس کے لیے تمام تحفظات و مراعات اور حقوق و واجبات (بعض استثناءات کو چھوڑ کر) کی ضمانت حاصل ہو۔ فرد اور حکومت کے اسی قانونی رابطہ کا نام شہریت ہے۔ حنفیہ کے علاوہ تمام فقہاء اس طرح کے قانونی معاہدہ کا اختیار صرف حکومت یا امیر المؤمنین کو دیتے ہیں، جب کہ حنفیہ اس اختیار کو عامۃ المسلمین تک وسیع کرتے ہیں۔[۴۶]

بعض فقہاء نے ان شرائط کی تفصیل بھی لکھی ہے جن کی پابندی غیر مسلم شہریوں

پر ضروری ہوتی ہے۔ علامہ ماوردیؒ نے ایسی چھ (٦) شرائط کا تذکرہ کیا ہے:

۱۔ کتابِ الٰہی کا احترام کریں اور اس کے بارے میں کسی طعن وتحریف کا تذکرہ نہ کریں۔

۲۔ ناموسِ رسالتؐ میں کوئی بے ادبی نہ کریں۔

۳۔ دینِ اسلام کی تحقیر نہ کریں۔

۴۔ کسی مسلمان خاتون سے زنا یا نکاح کا تعلق قائم نہ کریں۔

۵۔ کسی مسلمان کو دینی یا مالی فتنہ میں مبتلا نہ کریں۔

٦۔ اہلِ حرب کی مدد یا ان کے لیے جاسوسی نہ کریں۔

ان شرائط میں سے کسی بھی شرط کی خلاف ورزی پر ان کی شہریت منسوخ کی جاسکتی ہے۔ ۴۷

دراصل عقدِ ذمہ کو غیر مسلموں کے حق میں اسلام کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد غیر مسلموں سے حصولِ مال نہیں، بلکہ ان کو اسلامی معاشرہ میں رکھ کر اسلام کی عملی دعوت دینا ہے۔ ۴۸ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلم ملکوں کے دروازے ہر وقت غیر مسلموں کے لیے کھلے رہنے چاہئیں اور بلا کسی معقول وجہ کے اس کو بند نہیں کرنا چاہئے۔ یہ دعوتی اعتبار سے بھی فائدہ مند ہے، مالی اعتبار سے بھی، دوسرے ملکوں سے معاہدات کے اعتبار سے بھی اور اس سے خود مسلمانوں کے لیے بھی غیر مسلم ملکوں میں اقامت وشہریت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

البتہ اس معاملے میں بہ اتفاق فقہاء جزیرۂ عرب کا استثناء کیا گیا ہے۔ ۴۹ اس کی وجہ وہ حدیث پاک ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

لأخرجنّ الیهود والنصاریٰ من جزیرة العرب حتی لا أدع إلا مسلماً۔ ۵۰	میں یہود ونصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے ضرور نکال دوں گا اور یہاں مسلمان کے علاوہ کسی کو رہنے کی اجازت نہ دوں گا۔

ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

لایجتمع فی أرض العرب دینان ۔۵۱؎ عرب کی سرزمین پر دو دین جمع نہیں ہوسکتے۔

جزیرۃ العرب اہل جغرافیہ کے مطابق عرب کے اس جزیرہ نما علاقہ کا نام ہے جس کے غرب میں بحر قلزم (بحر احمر)، جنوب میں بحر عرب اور شرق میں خلیج بصرہ (خلیج عربی) ہے۔ جانب شمال کی حد کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ صاحب معجم البلدان کے مطابق اس کی حد عذیب سے حضرموت تک ہے۔ ابن الاعرابی نے بھی اس کی تحسین کی ہے، جب کہ اصمعی کا بیان یہ ہے کہ جزیرۃ العرب طول میں عدن سے ریف عراق تک اور عرض میں ابلہ سے جدۃ تک ہے۔ ۵۲؎

اسی لیے فقہاء کرام میں حنفیہ اور مالکیہ نے جزیرۃ العرب کو صرف مکہ اور مدینہ تک محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ پورے خطۂ عرب (جس کو اہل بلدیات جزیرۃ العرب مانتے ہیں) کو اس میں شامل کیا ہے، اس لیے کہ الفاظِ حدیث میں عموم ہے۔ ۵۳؎ البتہ مالکیہ میں علامہ قرطبیؒ کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد مکہ، مدینہ، یمامہ اور یمن کے اطراف ہیں۔ ۵۴؎ شافعیہ اور حنابلہ کے یہاں اس سے مراد سرزمین حجاز ہے۔ ۵۵؎ حجاز کی تشریح امام غزالیؒ وغیرہ نے یہ کی ہے کہ اس میں مکہ، مدینہ، یمامہ، نجد اور اطراف آتے ہیں۔ الوج، طائف اور خیبر مدینہ کے اطراف میں شامل ہیں۔ یمن اس میں داخل ہے کہ نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، اس لیے کہ بعض لوگ جزیرۃ العرب کی شام وعراق تک توسیع کرتے ہیں۔ ۵۶؎

حواشی ومراجع

۱؎ المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی، دار الکتب العلمیۃ بیروت ۲۰۰۴ئ، ج ۲، ص ۳۵، ۳۶

۲؎ بدائع الصنائع للکاسانی، ج ۱، ص ۳۱۶

۳؎ شرح مختصر خلیل للخرشی، ج ۵، ص ۸۸، الشاملۃ

۴؎ مواہب الجلیل لشرح مختصر خلیل للحطاب الرعینی، دار عالم الکتب، باب صلاۃ السفر، ج ۲، ص ۵۰۰

۵؎ المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی، ج ۲، ص ۳۶

۶؎ البدائع للکاسانی ج ۷ ص ۱۱۰، الاحکام السلطانیۃ للماوردی ص ۱۴۶، المبسوط للسرخسی ج ۱۰، ص ۸۴، السیر الکبیر ج ۵ ص ۱۸۶۵، ابن عابدین ج ۳ ص ۳۴۶، المہذب للشیرازی، ج ۲ ص ۲۵۱ وغیرہ

۷؎ حاشیۃ الدسوقی، ج ۲، ص ۲۰۶، ۲۰۷، الخرشی، ج ۳، ص ۱۵۱، کشاف القناع للبہوتی، ج ۳، ص ۱۱۴، المغنی لابن قدامۃ، ج ۱۰، ص ۵۱۷

۸؎ صحیح مسلم، ۴۷۴۰، مسند احمد، ۲۳۴۰۲، السنن الکبریٰ للبیہقی، ۱۸۲۱۰

۹؎ نہایۃ المحتاج للرملی، ج ۸، ص ۱۱۰، مغنی المحتاج للشربینی، ج ۴، ص ۲۶۴

۱۰؎ فتاویٰ ہندیہ، دار الفکر بیروت، ج ۲، ص ۱۹۷، وشرح السیر الکبیر، ج ۵، ص ۴۱، شرح الوقایۃ، ج ۶، ص ۸۰

۱۱؎ فتح القدیر لابن الہمام، دار الفکر، بیروت لبنان ۱۹۷۷ئ، ج ۵، ص ۴۶۰، وشرح السیر الکبیر، ج ۱، ص ۲۰۶، ج ۴، ص ۳۰۲

۱۲؎ شرح السیر الکبیر، ج ۴، ص ۳۰۲

۱۳؎ شرح السیر الکبیر، ج ۵، ص ۴۱

۱۴؎ صحیح مسلم، ۴۶۱۹، سنن ترمذی، ۱۶۱۷

۱۵؎ درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام، ج ۱، ص ۹۰، مادۃ ۸۷

۱۶؎ صحیح بخاری، ۳۸۵

۱۷؎ ہدایۃ مع فتح القدیر، ج ۵، ص ۳۰۳، جواہر الاکلیل، ج ۱، ص ۲۶۷، مغنی المحتاج، ج ۴، ص ۲۵۸، الاحکام السلطانیۃ لابی یعلیٰ، ص ۱۴۳-۱۴۴

۱۸؎ صحیح بخاری، ۳۸۵

۲۰؎ فتاویٰ الامام محمد رشید رضا، ج ۵، ص ۱۷۵۰

۲۱؎ حکم التجنس بجنسیۃ دولۃ غیر اسلامیۃ، ص ۷۱-۹۷

۲۲؎ تبدیل الجنسیۃ ردۃ وخیانۃ، ص ۲۷

۲۳؎ اس نقطۂ نظر کے قائل علماء کی فہرست طویل ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: مجلۃ الفقہ الاسلامی، ج ۲،ص ۱۱۵۶، حکم التجنس بجنسیۃ دولۃ غیر اسلامیۃ، ص ۱۱۳

۲۴؎ فتاوی اللجنۃ الدائمۃ للبحوث والافتائ، ج ۱۲،ص ۵۸

۲۵؎ فتویٰ نمبر ۸۸۹، ۲۰۰۰ء

۲۶؎ ویب سائٹ پران کا فتویٰ موجود ہے، (www.qardawi.net)

۲۷؎ فقہ الاقلیات المسلمۃ، ص ۶۰۹

۲۸؎ بحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ، ص ۳۲۰

۲۹؎ فتاویٰ محمد رشید رضا مصری، ج ۵،ص ۱۷۵۵

۳۰؎ احکام القرآن للجصاص، ج ۳،ص ۸۱۸

۳۱؎ ترمذی، کتاب السیر، ۱۶۵۴

۳۲؎ قواعد الفقہ لعمیم الاحسان المجددی البرکتی، دارالنشر، ج ۱،ص ۲۳، وکذا فی الفروق للقرافیؒ (م ۶۸۴ئ)، دارالکتب العلمیۃ بیروت ۱۹۹۸ئ، ج ۳،ص ۶۸

۳۳؎ الاشباہ والنظائر لابن نجیمؒ، ج ۱،ص ۱۱۱

۳۴؎ الاشباہ والنظائر لابن نجیمؒ، ج ۱،ص ۸۸، الاشباہ والنظائر للسیوطیؒ، ص ۸۷

۳۵؎ الاشباہ والنظائر، ص ۹۱

۳۶؎ قواعد الفقہ لعمیم الاحسان، دارالنشر، ج ۱، ص ۱۹، فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت، ج ۱،ص ۴۳، الفروق للقرافیؒ ج ۷،ص ۸۳ ۳

۳۷؎ الاشباہ والنظائر لابن نجیم، دارالکتب العلمیۃ بیروت ۱۹۸۰ئ، ص ۸۸، الاشباہ والنظائر للسیوطی، دارالکتب العلمیۃ بیروت، ص ۸۷، دررالحکام شرح مجلۃ الاحکام، ج ۱،ص ۴۱، مادۃ ۲۸

۳۸؎ المبسوط للسرخسی، ج ۱۰، ص ۸۸، احکام القرآن لابن العربی، ج ۱، ص ۵۱۵، الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، ج ۵، ص ۳۵۱، کشاف القناع للبہوتی، ج ۳،ص ۱۳۱

۳۹؎ سنن ابوداؤد، باب الاقامۃ بارض الشرک، ۲۷۸۹

۴۰؎ معالم السنن للخطابی، کتاب الجہاد، باب علیٰ مایقاتل المشرکون، المطبعۃ العلمیۃ، حلب

۱۹۳۳ئ، ج ۲، ص ۲۷۲۔

۴۱۔ احکام القرآن لابن العربی، ج ۱، ص ۴۸۶، الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، ج ۵، ص ۳۵۱

۴۲۔ المبسوط للسرخسی، ج ۱۰، ص ۸۸

۴۳۔ البیان والتحصیل لابن رشد، دارالمغرب الاسلامی، بیروت، ۱۹۸۴ئ، ج ۴، ص ۱۷۱، ملحق المدونۃ الکبریٰ، دارالکتب العلمیۃ، ج ۵، ص ۴۶۶، بیروت ۱۹۹۴ئ، المحلی لابن حزم، ج ۱۱، ص ۳۴۹

۴۴۔ المغنی لابن قدامۃ، ج ۱۰، ص ۵۰۷

۴۵۔ فتح الباری شرح صحیح البخاری لابن حجر، دارالفکر بیروت، ج ۷، ص ۱۹۱

۴۶۔ البدائع للکاسانی، ج ۷، ص ۱۱۱، ابن عابدین، ج ۳، ص ۲۷۵، الاموال لابی عبید، ص ۸۷، الاحکام السلطانیۃ للماوردی، ص ۱۴۵

۴۷۔ الاحکام السلطانیۃ للماوردی، ص ۱۴۵

۴۸۔ فتح القدیر والعنایۃ علی الہدایۃ، ج ۵، ص ۲۱۳۔ ۲۱۴

۴۹۔ ابن عابدین، ج ۳، ص ۲۷۵، الماوردی، ص ۱۶۷، احکام اہل الذمۃ لابن القیم، ج ۱، ص ۱۷۶-۱۸۶

۵۰۔ صحیح مسلم، باب اخراج الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب، ۴۶۹۳، ترمذی، ۱۶۰۶

۵۱۔ مسند احمد، طبع المیمنیۃ، ج ۶، ص ۲۷۵، مجمع الزوائد للہیثمی، طبع القدسی، ج ۵، ص ۳۲۵، الاموال لابی عبید، دارالفکر ۱۳۹۵ھ، ص ۱۲۸

۵۲۔ معجم البلدان لیاقوت الحموی، (م ۶۲۶ھ) جزیرۃ العرب، ج ۱، ص ۴۹۵

۵۳۔ فتح القدیر لابن ہمام، ج ۴، ص ۳۷۹، حاشیۃ ابن عابدینؒ، ج ۳، ص ۲۷۵

۵۴۔ الحطاب، ج ۳، ص ۳۸۱، بحوالہ موسوعۃ أرض العرب

۵۵۔ احکام اہل الذمۃ لابن القیم، ج ۱، ص ۱۷۶

۵۶۔ الوجیز للغزالی، ج ۲، ص ۱۹۹، بحوالہ الموسوعۃ الفقہیۃ، ج ۳، ص ۱۲۹

☆☆☆

سرکاری مناصب وذرائع کا استعمال
تعلیماتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

جناب عبدالمہیمن

رسولِ خدا حضرت محمد ﷺ نے معاشرے کو مثالی بنانے کے لیے بہت سے اقدامات کیے۔ اُن میں سے ایک سرکاری مناصب کا قیام اور ان پر عمّال کی تعیناتی تھا۔ ان مناصب میں سے کچھ مکہ میں پہلے سے موجود تھے۔ آپؐ نے ان کو قائم رکھا اور بعض نئے مناصب کا اضافہ کیا۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد مدینہ کے داخلی نظم ونسق کو قائم رکھنے کے لیے آپؐ نے کچھ شعبے قائم کیے اور ان میں عمّال متعین کیے۔ آپؐ نے جو شعبے قائم کیے ان میں دستاویزات، احتساب، داخلہ، خارجہ، مالیات، عساکر، تعلیم، معیشت اور مذہبی امور نمایاں تھے۔[۱]

مدینہ میں نبی کریم ﷺ کے ذریعے قائم کردہ شہری ریاست میں گورنر، وزرائ، امرائ، سفیر، سیکرٹری اور دیگر عہدے دار شامل تھے۔ آپؐ کے عمّال اور ان کو دیے گئے کاموں کی تفصیل بتاتے ہوئے علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں کہ ''آپؐ ساٹھ سال کی عمر میں بھی حکومت کے تمام کام خود انجام دیتے تھے: ولاۃ اور عمال کا تقرر، مؤذنین اور ائمہ کی تعیین، محصلینِ زکوٰۃ وجزیہ کی نام زدگی، غیر قوموں سے مصالحت، مسلمان قبائل میں جائیدادوں کی تقسیم، فوجوں کی آراستگی، مقدمات کا فیصلہ، قبائل کی خانہ جنگیوں کا انسداد، وفود کے لیے تعیینِ وظائف، اجرائے فرامین، نومسلموں کے انتظامات، مسائل شرعیہ میں افتائ، جرائم کے لیے اجرائے تعزیر، ملک کے بڑے بڑے سیاسی انتظامات، عہدے داروں کی خبر گیری اور احتساب۔ دور کے صوبوں میں متعدد صحابہ گورنر بنا کر بھیج دیے

گئے تھے، لیکن مدینہ اور اطرافِ مدینہ کے فرائض آپؐ خود انجام دیتے تھے۔ ۲؎

ابن قیّم الجوزیہؒ کے مطابق نبی کریم ﷺ نے متعدد عمّال متعین کیے اور ان کو مختلف ذمہ داریاں دیں۔ اس کی تفصیل وہ یوں بیان کرتے ہیں کہ ''آپؐ نے متعدد عمّال سے کام لیا۔ باذان بن ساسان کسریٰ کی طرف سے یمن کے گورنر تھے۔ اسلام لے آئے تو آپؐ نے انہیں اپنے عہدے پر برقرار رکھا۔ باذان سب سے پہلے مسلمان ہیں، جو گورنر بنائے گئے۔ ان کے انتقال پر رسول اللہ ﷺ نے ان کے بیٹے کو صنعاء کا گورنر مقرر کیا اور جب وہ شہید ہو گئے تو خالد بن سعید بن العاصؓ کو روانہ فرمایا۔ مہاجر بن ابی امیہ المخزومیؓ کو کندہ اور صدف کا حاکم مقرر کیا، زیاد بن امیہ انصاریؓ کو حضر موت، ابوموسیٰ اشعریؓ کو زبید، عدن، زمع اور ساحل، ابوسفیان صخر بن حربؓ کو نجران، ان کے بیٹے یزیدؓ کو تیما، عتابؓ بن اسید کو مکہ اور موسمِ حج کا حاکم مقرر کیا، حالاں کہ اس وقت ان کی عمر صرف بیس سال تھی۔ حضرت علیؓ کو یمن کے خمس کی تحصیل اور منصبِ قضا پر مقرر کیا، عمرو بن العاصؓ کو عمان کی حکومت سپرد کی۔ اس کے علاوہ متعدد صحابہ کو صدقات اور زکوٰۃ وصول کرنے پر متعین کیا۔ ۳؎

مدینہ میں رسول اللہ ﷺ نے اُن صحابہ کرامؓ کو وہی عہدے دیے جو مکہ مکرمہ میں ان کے خاندانوں کو حاصل تھے۔ ابوبکر صدیقؓ کے خاندان میں عدالتی ذمہ داری تھی اور عمرِ فاروقؓ کے خاندان میں سفارت کا عہدہ تھا۔ ۴؎ آپؐ کی قائم کردہ ریاست میں وزراء بھی ہوتے تھے، جن کے ذمے مختلف ذمہ داریاں کی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر ابوبکر صدیقؓ کی حیثیت وزیرِ اوّل کی سی تھی۔ امام حاکم نے اس بارے میں یہ روایت نقل کی ہے:

كان أبو بكر الصديق من النبي ﷺ مكان الوزير فكان يشاوره فيجميع الأمور ولم يكن رسول الله ﷺ يقدّم عليه أحداً۔ ۵؎	ابوبکر صدیقؓ کا درجہ نبی کریم ﷺ کے ہاں وزیر کا تھا، آپؐ ان سے تمام امور میں مشورہ کرتے تھے اور کسی کو بھی ان پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔

رسول اکرم ﷺ نے مختلف مواقع پر اور مختلف اغراض سے عمّال مقرر

فرمائے۔ اس کی تفصیل بتاتے ہوئے مولانا عبدالرؤف داناپوریؒ لکھتے ہیں کہ ''جب حضور ﷺ طائف سے مدینہ واپس آئے اور ۹ھ شروع ہوا تو اعراب سے صدقات وصول کرنے کے لیے آپؐ نے آدمی بھیجے: عیینہ بن حصنؓ کو بنی تمیم کی طرف، یزید بن الحصینؓ کو اسلم اور غفار کی طرف، عباد بن بشر الاشہلیؓ کو سلیم اور مزینہ کی طرف، رافع بن مکیثؓ کو جہینہ کی طرف، عمرو بن العاصؓ کو بنوفزارہ کی طرف، ضحاک بن سفیانؓ کو بنو کلاب کی طرف، بشیر بن سفیانؓ کو بنو کعب کی طرف اور ابن اللتبیۃ الازدیؓ کو بنو کلاب کی طرف۔ آپؐ نے سب کو تاکید کر دی تھی کہ لوگوں کے بہترین اور مرغوب اموال صدقہ میں نہ لیے جائیں، چنانچہ جب ابن اللتبیۃ الازدیؓ واپس آئے تو ان سے اس بارے میں محاسبہ کیا گیا۔ حضور ﷺ نے ابن ابی امیہؓ کو صنعائ، زیاد بن لبید انصاریؓ کو حضر موت، عدی بن حاتمؓ کو قبیلہ طی اور بنواسد، مالک بن نویرہؓ کو بنوحنظلہ، علاء بن الحضرمیؓ کو بحرین اور حضرت علیؓ کو نجران کی طرف بھیجا، تاکہ صدقہ جمع کریں اور جزیہ وصول کریں۔ یہ سب حضور ﷺ کے امراء اور عاملین تھے۔۶؎

نبی کریم ﷺ کی انتظامیہ کے حوالے سے ڈاکٹر محمد حمیداللہ لکھتے ہیں کہ ''دارالحکومت میں رسول اللہ ﷺ خود نظام ونسق کی نگرانی کرتے تھے، مثلاً خط وکتابت اور قرآن کو، جو وحی کی شکل میں نازل ہو رہا تھا، تحریری شکل میں محفوظ کرنے کے لیے سیکرٹری مقرر تھے، آپؐ اس ضمن میں اکابر صحابہؓ سے مشورے کا اہتمام بھی فرماتے۔ صوبوں میں آپؐ نے گورنر مقرر فرمائے، جن کی سرگرمیوں اور کارکردگی کی آپؐ نگرانی کرتے۔ شہروں کی آبادکاری کے حوالے سے آپؐ کی ہدایت خاص طور پہ قابلِ ذکر ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ شہر کی گلیاں اتنی کھلی رکھو کہ دو اونٹ اپنے ساز وسامان سمیت آسانی سے ایک دوسرے کے پاس سے گزر جائیں۔ بازاروں کو بڑی اہمیت دی جاتی اور آپؐ خود ان کا معاینہ فرماتے اور دھوکہ دہی کی روک تھام کرتے۔ بازار کے معاینے کے لیے انسپکٹر بھی مقرر تھے۔ مال ذخیرہ کرنے اور کاروبار میں غلط بیانی کی سخت ممانعت تھی اور سزا بھی دی جاتی تھی۔ درآمدی سامان پر ڈیوٹی عائد کی جاتی تھی''۔۷؎ انھوں

نے مزید لکھا ہے کہ ''جب مدینہ کی آبادی بڑھی تو نبی کریم ﷺ نے مزید عمّال مقرر کیے اور اسی حوالے سے خاتون انسپکٹر کی تعیناتی کا بھی ذکر ملتا ہے۔ مدینہ منورہ کی آبادی میں اضافہ ہونے کی وجہ سے نئی منڈیوں کا قیام اور ان کی نگرانی اور نگہبانی کا مستقل انتظام وقت کی ضرورت تھی، چنانچہ ایک تعلیم یافتہ خاتون حضرت شفاء بنت عبداللہؓ کو مارکیٹ کی کچھ ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ چوں کہ ان کے عہدے کا صحیح پتا نہیں لگ سکا، اس لیے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انہیں مارکیٹوں کی انسپکٹر جنرل یا تاجروں پر کسٹم ڈیوٹی کی کلکٹر یا کم از کم تاجر خواتین پر انسپکٹر مقرر کیا گیا تھا''۔۸؎

سرکاری مناصب اور تعلیماتِ نبوی

نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات زندگی کے ہر شعبے میں انسانوں کو عملی ہدایات فراہم کرتی ہیں۔ یہی معاملہ سرکاری مناصب کا بھی ہے۔ آپؐ کے کچھ ارشادات تو عمومی نوعیت کے ہیں، جن میں دیگر افراد کے ساتھ سرکاری مناصب کے حامل لوگوں کے لیے بھی رہ نمائی موجود ہے، جب کہ کئی ایک مواقع پر آپؐ نے براہ راست سرکاری ملازمین کو مخاطب کر کے ان کی رہ نمائی فرمائی ہے۔ مثال کے طور پر یہاں آپؐ کے چند ارشادات نقل کیے جاتے ہیں:

اخوت و بھائی چارہ

اسلام کی عمومی تعلیمات میں اخوت اور بھائی چارے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ سرکاری مناصب اور سرکاری اہل کاروں کی ذمہ داریوں کے پس منظر میں اس کی مزید اہمیت واضح ہوتی ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

المسلم أخو المسلم لايظلمه ولا يسلمه ومن كان فی حاجة أخيه كان الله فی حاجته ومن فرج عن مسلمٍ	مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اُس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اُسے کسی کے حوالے کرتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی کسی حاجت کو پورا کرے گا،

کربةً فرّج اللہ عنه کربةً من کرباتِ یوم القیامةِ ومن سترَ مسلماً سترہُ اللہ یوم القیامة۔۹؎

اللہ اِس کی حاجت پوری کرے گا اور جو شخص کسی مسلمان کو کسی مصیبت سے نکالے گا، اللہ اسے روزِ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت سے نکال دے گا، اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشاد کے مطابق سرکاری ملازمین کے لیے بڑی واضح رہ نمائی موجود ہے۔ان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ عوام کی حاجتوں کو پورا کریں، ان پر ظلم نہ کریں، انھیں بے جا پریشان نہ کریں، ان کا استحصال نہ کریں، انہیں غلط ہاتھوں کے حوالے نہ کریں اور ان کے مسائل کا حل فراہم کریں۔ یہ سب کرنے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ سے امید رکھیں کہ وہ ان کے مسائل کو حل کرے گا اور ان کی حاجات کو پورا کرے گا۔

خیرخواہی

اسلام کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک اہم ترین خصوصیت 'خیر خواہی' ہے۔ایک موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا: اِنّ الدّینَ النّصیحةُ (بے شک دین خیرخواہی ہے) صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کس سے خیرخواہی؟ فرمایا: ''اللہ سے اور اُس کی کتاب سے اور اس کے رسول سے اور اہل ایمان کے ائمہ سے اور ان کے عام لوگوں سے''۔۱۰؎

عام لوگوں کو نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ان امور کی طرف دعوت دی جائے جن میں ان کی مصلحت ہو اور دین کے کام میں ان کا تعاون کیا جائے ، ناداروں کی مالی امداد کی جائے ،مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری نہ کی جائے ، انہیں ضرر سے بچایا جائے اور انہیں فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جائے۔۱۱؎ اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ بلا امتیاز معاشرے کے تمام افراد کے لیے ہے، مگر خصوصاً اس میں سرکاری مناصب کے حامل افراد کے لیے واضح ہدایت موجود ہے۔

مولانا گوہر رحمن اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ ''اربابِ اختیار کی خیرخواہی اور ان کے ساتھ حسنِ تعلق یہ ہے کہ حق بات میں ان کی مدد کی جائے، بھلائی اور نیکی میں ان کی اطاعت کی جائے، غلطیوں اور غفلتوں پر ان کو متنبہ کیا جائے اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ پر انہیں آمادہ کیا جائے، جب کہ عام مسلمانوں کی خیرخواہی اور ان کے ساتھ حسنِ تعلق یہ ہے کہ ان کو ضرر نہ پہنچایا جائے اور ان کی ضروریات پوری کی جائیں، حسد، بغض اور دھوکہ دہی سے اجتناب کیا جائے۔ ۱۲؎

کسبِ حلال

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اسلام اپنے ماننے والے ہر شخص سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ حلال رزق کمائے۔ تاہم اس کا سب سے زیادہ اطلاق سرکاری اہل کاروں اور ملازمین پر ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان کے پاس حرام کمانے کے مواقع بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

لاتزول قدماعبدیوم القیامة حتی یُسئل عن عمرہ فیما أفناہ وعن علمہ فیم فعل وعن مالہ من أین اکتسبہ وفیم أنفقہ وعن جسمہ فیم أبلاہ۔ ۱۳؎

قیامت والے دن کسی بھی انسان کے قدم اس وقت تک نہیں ہل سکیں گے جب تک اُس سے اُس کی عمر کے بارے میں پوچھا نہ لیا جائے کہ اُس نے اُسے کہاں گزارا؟ اور اُس کے علم کے بارے میں کہ اِس کا کیا کیا؟ اور اُس کے مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ اور اُس کے جسم کے بارے میں کہ کہاں استعمال کیا؟

قیامت کے روز دیگر افراد کی طرح سرکاری ملازمین کو بھی بارگاہِ خداوندی میں اس بات کا جوب دینا ہوگا کہ انہوں نے اپنے منصب کا استعمال کر کے جو مال کمایا ہے وہ حلال بھی تھا یا نہیں؟ اپنی عمر کہاں گزاری؟ جو ذمے داریاں ان پر ڈالی گئی تھیں ان سے کس حد تک عہدہ برا ہوئے؟

رعایت وتخفیف

اسلام نے ہمیشہ آسانی، نرمی، رعایت اور تخفیف کا درس دیا ہے۔ یہ ہدایت اربابِ اختیار کے لیے بھی ہے۔ اس لیے کہ ان کے پاس اختیار ہوتا ہے۔ وہ چاہیں تو سختی کرسکتے ہیں اور چاہیں تو معاملے میں نرمی سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپؐ نے بڑی وضاحت سے ارشاد فرمایا ہے:

اللھم من ولی من أمر أمتی شیئاً فشقّ علیھم فاشقق علیه ومن ولی من أمر أمتی شیئاً فرفق علیھم فارفق به۔ ۱۴

اے اللہ! جس کو میری امت میں کسی کام کا اختیار ملے اور وہ لوگوں پر سختی کرے، تو بھی اس پر سختی کر، اور جس کو میری امت میں کسی کام کا اختیار ملے اور وہ لوگوں پر نرمی کرے، تو بھی اس پر نرمی کر۔

سرکاری ملازمین، جو اختیارات کے مالک ہوتے ہیں، اگر انہوں نے ان اختیارات کا درست استعمال کیا اور عوام کو آسانیاں فراہم کیں تو نبی کریم ﷺ کی دعا ان کی نجات کا باعث بنے گی اور اللہ تعالیٰ ان پر نرمی کرے گا اور اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو نبی کریم ﷺ کی دعا کے بہ موجب ان کو اس سے بھی زیادہ سختی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

من ولی من أمر المسلمین شیئاً، فاحتجب عن ضعفة المسلمین، احتجب اللہ عنه یوم القیامة۔ ۱۵

جس کو مسلمانوں کے کسی کام کا اختیار ملے اور وہ کم زور مسلمانوں سے اعراض کرے، اللہ قیامت کے دن اس سے اعراض کرے گا۔

سرکاری اداروں میں یہ بات بہت عام ہے کہ سرکاری ملازمین صرف انہی لوگوں کا خیال رکھتے ہیں جو ان سے زیادہ صاحبِ اختیار ہوں، یا پھر اُن سے اِن کو کوئی فائدہ ہو۔ جن لوگوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا ان سے عموماً اعراض کیا جاتا ہے، ان کو دھتکارا جاتا ہے، ان کے مسائل حل کیے جاتے ہیں نہ ان کی رہ نمائی کی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بڑی وضاحت سے فرمایا ہے کہ ایسا کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اعراض کرے گا۔ اس سے زیادہ بدبختی کسی انسان کے لیے اور کیا ہوسکتی ہے۔

خوش اخلاقی

انسان کا المیہ ہے کہ جب اس کے پاس اختیار آتا ہے تو بسا اوقات اس کا غلط استعمال کرنے لگتا ہے، بلکہ کبھی کبھار اخلاقی حدوں سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ اسلام خوش اخلاقی پر بہت زور دیتا ہے۔ سرکاری منصب داروں کے پاس اس کے مواقع اوروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اس سلسلے میں نہ صرف اپنے فرمودات سے بلکہ اپنے طرزِ عمل سے بھی رہنمائی فرمائی ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

انّ من شرّ النّاسِ من ترکهُ النّاسُ أو ودعهُ النّاسُ اتّقاءفُحشهِ۔۱۶؎

لوگوں میں بدترین شخص وہ ہے جس کی بدکلامی کی وجہ سے لوگ اسے چھوڑ دیں۔

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ سرکاری ملازمین کی بدکلامی اور بد اخلاقی کی شکایت کرتے ہیں۔ ان کا معاملہ عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر کسی انسان سے شکایت ہو تو اس سے قطع تعلق کیا جا سکتا ہے، کسی دکان دار سے شکایت ہو تو دوسری دکان جایا جا سکتا ہے، لیکن سرکاری ملازمین کے معاملے میں اکثر یہ ممکن نہیں ہوتا۔ لوگوں کو بار بار ان ہی سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس صورت میں ان ملازمین کی بداخلاقی کافی مسائل پیدا کرتی ہے۔

رشوت خوری سے اجتناب

رشوت سرکاری محکموں کا ناسور بن گئی ہے۔ اس لعنت نے سارے سرکاری ڈھانچے، اس کے نظام اور اس کی کارکردگی کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جہاں معاشرے کی دیگر برائیوں کی نشان دہی کی ہے وہیں رشوت کی واضح الفاظ میں مذمت کی ہے، رشوت خوری میں ملوث افراد کی حوصلہ شکنی فرمائی اور ان پر لعنت بھیجی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں:

لعنَ رسولُ اللهِ ﷺ الرّاشي والمُرتشي۔۱۷؎

رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے پر لعنت بھیجی ہے۔

اس سلسلے میں عموماً یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ سرکاری ملازمین کو ایسے تحفے تحائف دیے جاتے ہیں جن کا مقصد صرف اپنا کام کروانا ہوتا ہے۔ یہ بھی رشوت ہی کی ایک صورت ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں جب ایک سرکاری اہل کار نے کہا کہ فلاں فلاں چیزیں مجھے تحفے میں ملی ہیں تو آپؓ نے فرمایا: ''گھر جا کر بیٹھو اور پھر دیکھو کہ تمھیں کتنے تحفے ملتے ہیں''۔

مناصب اور اہلیت

مختلف معاملات کو احسن طریقے سے چلانے اور عوام کو سہولت فراہم کرنے کے لیے حکومت مختلف مناصب قائم کرتی ہے۔ ضروری ہے کہ ان مناصب پر اہل لوگوں کو فائز کیا جائے۔ اگر ان پر ایسے لوگوں کو متعین کر دیا جائے جو ان کے اہل نہ ہوں تو فساد اور انارکی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی میں اہلیت کے معاملے میں بڑے واضح احکام دیے گئے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھۡلِھَا۔ (النسائ:۵۸) اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل لوگوں کو ادا کرو۔

امام طبریؒ فرماتے ہیں کہ ''اس آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے اربابِ اختیار کو حکم دیتا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے اپنی رعیت کے حقوق ادا کریں، ان پر ظلم نہ کریں، کسی معاملے میں ان میں تفریق نہ کریں، اہل لوگوں کے ہاتھ سے معاملات لے کر نااہل لوگوں کے ہاتھ میں نہ دیں اور لوگوں کے درمیان عدل و انصاف سے فیصلے کریں۔ یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے اور اپنے رسول ﷺ کی زبانی بیان کیا ہے۔ اگر اس کو ملحوظِ خاطر نہ رکھا تو یہ ظلم تصور کیا جائے گا''۔ ۱۸؎

امام قرطبیؒ اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ ''یہ قرآن کی اہم ترین آیات میں سے ہے۔ یہ سارے دین اور شریعت کا احاطہ کرتی ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کے اربابِ اختیار کو خاص طور پر مخاطب کیا گیا ہے۔ اس کی روشنی میں ان پر لازم ہے

کہ وہ مال کی تقسیم، ظلم کے خاتمے اور فیصلوں میں عدل وانصاف سے کام لیں''۔ ۱۹؎

ابن کثیرؒ کے مطابق ''اس آیت کے الفاظ وسیع المعانی ہیں۔ ان میں اللہ عزّوجل کے حقوق کی ادائیگی بھی شامل ہے، جیسے روزہ، نماز، زکوٰۃ، کفارہ، نذر وغیرہ اور بندوں کے باہمی حقوق بھی شامل ہیں۔ پس جو حق کو ادا نہ کرے گا اس کی پکڑ قیامت کے دن ہوگی اور قیامت کے دن ہر حق دار کو اس کا حق دلوایا جائے گا''۔ ۲۰؎

اس آیت کی تفسیر میں مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''اس سے معلوم ہوا ہے کہ حکومت کے عہدے اور منصب جتنے ہیں وہ سب اللہ کی امانتیں ہیں، جس کے امین وہ حکام اور افسر ہیں جن کے ہاتھ میں عزل ونصب کے اختیارات ہیں۔ ان کے لیے جائز نہیں کہ کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کو سپرد کر دیں جو اپنی عملی یا علمی قابلیت کے اعتبار سے اس کا اہل نہیں، بلکہ اُن پر لازم ہے کہ ہر کام اور عہدے کے لیے اپنے دائرۂ حکومت میں اس کے مستحق کو تلاش کریں۔ پوری اہلیت والا سب شرائط کا جامع کوئی نہ ملے تو موجودہ لوگوں میں قابلیت اور امانت داری کے اعتبار سے جو سب سے زیادہ فائق ہو اس کو ترجیح دی جائے''۔ ۲۱؎

قرآنِ کریم کی طرح احادیثِ نبوی میں بھی اہلیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **اذا ضیّعتِ الأمانۃُ فانتظر السّاعۃَ**۔ (جس وقت امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرو)، پوچھا گیا کہ امانت کا ضائع کرنا کس طرح ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: **اذا وُسِّدالأمرُ الی غیرِ أھلہ فانتظر السّاعۃ** ۲۲؎ (جب کام نااہل (لوگوں) کے سپرد کر دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو)۔

حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: کیا آپؐ مجھے کوئی عہدہ نہیں دیں گے؟ آپؐ نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا:

یا أباذرٍ انک ضعیفٌ وانھا امانۃٌ وانھا یوم القیامۃِ خزیٌ وندامۃٌ ، الّا من أخذھا بحقِّھا وأدّی الّذی علیہ فیھا۔ ۲۳؎	اے ابوذر! تم کم زور ہو اور یہ (عہدہ) امانت ہے۔ قیامت کے دن یہ باعثِ رسوائی و ندامت ہوگا، سوائے اس کے جو اس کا حق ادا کرے اور اس کے فرائض پورے کرے۔

کسی ذمہ داری کی طلب اور خواہش شریعت کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان ذمہ داریوں پر افراد کا تعین کیسے ہو؟ یہاں صدرِ مملکت اور دوسرے سربراہوں کی ذمہ داری ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ان پر واجب ہے کہ مملکت کے تمام کاموں کے لیے بہترین اور موزوں ترین اشخاص کا انتخاب کریں۔ ان کے لیے درست نہیں ہے کہ وہ رشتہ، دوستی، تعلقات یا پارٹی بندی کی وجہ سے اس میں کسی غیر نااہل کا انتخاب کریں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من استعمل عاملاً من المسلمین وھو یعلم ان فیھم اولیٰ بذلک منه و اعلم بکتاب اللہ و سنة نبیه فقد خان اللہ و رسوله و جمیع المسلمین۔ ۲۴؎

جس نے مسلمانوں کے کسی معاملے کا ذمہ دار ایک ایسے شخص کو بنایا جس سے زیادہ مناسب لوگ بھی پائے جاتے ہوں اور وہ اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت کے زیادہ جاننے والے ہوں تو اس نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی۔

اہلِ مناصب کا احتساب

سرکاری مناصب کے معاملے میں اہلیت کے بعد اگلا مرحلہ احتساب کا ہے۔ اولاً کسی منصب پر تقرر میں اہلیت کے سلسلے میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد جن لوگوں کا تقرر ہو ان کا احتساب اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ مناصب اور احتساب کے درمیان بہت گہرا تعلق ہے۔ دراصل احتساب سرکاری مناصب کے درست استعمال کا ضامن ہے۔ اس کی ضرورت اسلامی ریاست کے روزِ آغاز ہی سے محسوس کر لی گئی تھی۔ جب تک ریاست مدینہ کی حدود تک محدود رہی اس وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنفسِ نفیس اس کام کو انجام دیا کرتے تھے۔ اس کے لیے آپؐ وقتاً فوقتاً بازار کا چکر لگاتے اور کوئی غلط کام دیکھتے تو فوراً متنبہ فرماتے اور اس کی اصلاح کرتے۔ ایک بار آپؐ بازار کے معاینہ کے لیے تشریف لے گئے۔ وہاں ایک صاحب گندم فروخت کر رہے تھے۔ آپؐ نے گندم کے ڈھیر میں دستِ مبارک ڈالا تو انگلیوں کو نمی محسوس ہوئی۔

آپؐ نے فرمایا: گندم والے! یہ کیا؟ ان صاحب نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! گندم رات کی بارش میں بھیگ گیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: اس گیلے گندم کو اوپر کیوں نہیں رکھا؟ آپؐ نے مزید فرمایا:

من غشّ فلیس منّی ۔۲۵؎ جس نے دھوکہ بازی کی وہ ہم میں سے نہیں۔

ایک موقعہ پر آپؐ نے ایک صاحب کو کوئی چیز تولتے ہوئے دیکھا تو ارشاد فرمایا:

أَتّزِنْ وأَرجِحْ۔۲۶؎ اچھی طرح تولو اور جھکتا ہوا تولو۔

جب اسلامی ریاست کی مدینہ سے باہر توسیع ہوگئی تو احتساب کے لیے مستقلاً افراد مقرر کر دیے گئے۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں عمر فاروق ؓ اور مکہ مکرمہ میں سعید بن العاص ؓ کو محتسب مقرر کیا گیا۔حضرت صدیقِ اکبر ؓ کا دو سالہ مختصر دورِ حکومت شدید ہنگامی حالات میں گزرا۔جنگوں، بغاوتوں اور شورشوں کو ہی فرو کرنے میں سارا وقت صرف ہوگیا۔ اس لیے ان کے دور کے نظامِ حسبہ کی تفصیلات نہیں ملتیں، لیکن چوں کہ وہ ہر معاملے میں انتہائی کوشش کرتے تھے کہ اس کا نظم اسی طرح چلائیں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مبارک زمانے میں چل رہا تھا، اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ عہدِ نبوی میں جو اصحاب محتسب مقرر ہوئے تھے اور جو فرائض ان کے سپرد ہوئے تھے وہ عہدِ صدیقی میں بھی علیٰ حالہ باقی رہے ہوں گے، تاہم حضرت عمر فاروق ؓ نے اس ادارے کو بہت ترقی دی اور جابجا محتسبین مقرر فرمائے۔ دارالخلافہ میں اس اہم فریضہ کو وہ بنفسِ نفیس انجام دیتے تھے۔مشہور صحابی حضرت محمد بن مسلمہ انصاری ؓ کو دورِ فاروقی میں ادارۂ احتساب اور 'ادارۃ النظر فی المظالم' کا انسپکٹر جنرل مقرر کیا گیا تھا۔ وہ مختلف علاقوں اور صوبوں کا دورہ کرتے رہتے تھے اور دوسرے علاقائی محتسبین کی نگرانی کے علاوہ خود بھی احتساب کا کام انجام دیتے تھے۔۲۷؎

سرکاری اہل کاروں کے احتساب کے سلسلے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں: ''امام کو اپنے نائبین اور معاونین سے غافل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس کو چاہیے کہ وہ ہر روز، دو روز (یا مناسب وقفوں) کے بعد ان عہدہ داروں کے حالات اور کارکردگی کے بارے میں پوچھا کرے اور اپنی ذاتی رائے اور عقل و فراست کے ساتھ ان کی

مناسب رہ نمائی کرے۔ اِن کو بے لگام آزادی نہیں دینی چاہیے۔ اگر ان کی کارکردگی اور فرضِ منصبی کی ادائیگی واضح طور پر اچھی ہے تو ان سے خوش نودی کا اظہار کر کے ان کی قدر افزائی کرے، تاکہ وہ مزید بہتر کارکردگی دکھانے کی سعی کریں۔ اگر ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو ان کی اصلاح کے لیے مؤثر زجر و توبیخ سے کام لے۔ اگر کسی شخص کے متعلق امام کو یہ خوف ہو کہ اعلیٰ منصب ملنے پر اس کا مزاج بگڑ جائے گا اور طوقِ اطاعت پھینک دے گا تو ایک بہتر تدبیر یہ ہے کہ اس سے متعلق محکمہ اور منصب کو مصلحت کے مطابق دو یا دو سے زیادہ اشخاص کے سپرد کر دے۔ اس طرح اس کی باغیانہ کیفیت اور مزاج کی شدت ٹھنڈی پڑ جائے گی'۔ ۲۸؎

احساسِ ذمہ داری:

ہر منصب اس امر کا متقاضی ہے کہ اس سے متعلقہ فرائض کو ذمہ داری کے ساتھ ادا کیا جائے۔ اگر احساسِ ذمہ داری نہ ہو گا تو اس منصب سے مطلوبہ مقاصد کا حصول ممکن نہیں ہوگا اور نہ اس منصب کا حامل اس کا اہل سمجھا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

ألا کلکم راعٍ و کلکم مسئول عن رعیّته، فالامام الّذی علی النّاس راع وھو مسئول عن رعیّته۔ ۲۹؎

اچھی طرح جان لو کہ تم میں سے ہر ایک نگراں اور ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق باز پرس کی جائے گی۔ جو حکمراں لوگوں پر حکومت کرتا ہے، وہ نگراں اور ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

حکومت اور دیگر سرکاری مناصب کے تعلق سے نگراں کا مطلب یہ ہے کہ وہ شریعت کی حفاظت کرتا ہو، حدود قائم کرتا ہو، لوگوں کے درمیان عدل و انصاف سے کام لیتا ہو اور جو ذمہ داری اسے سونپی گئی ہے اسے احسن طریقے سے ادا کرتا ہو۔ اہلِ مناصب کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایمان داری سے اپنے فرائض سرانجام دیں اور اظہارِ حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں، اس بات سے قطع نظر کہ کوئی ان کے کام کو پسند کرے یا نہ

کرے۔تمام افراد کی اصلاح ان کی ذمہ داری میں شامل نہیں ہے۔ ۳۰؎

احساسِ ذمہ داری کے حوالے سے حضرت عباد بن بشرؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ انھیں ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہرہ دینے کی ذمہ داری دی۔وہ خشوع وخضوع کے ساتھ نماز میں مصروف ہو گئے۔ اسی دوران ان کو ایک تیر آ کر لگا اور جسم میں پیوست ہوگیا۔انھوں نے اس کی بالکل پروانہیں کی اور نہ اس کے بعد آنے والے تیر کی پروا کی، اس لیے کہ ان کی بشریت اس وقت اپنے تمام احساسات کے ساتھ اپنے رب کی طرف ہمہ تن متوجہ اور اپنے خالق سے مناجات کی لذت میں مدہوش تھی۔ پھر جب ان کا احساس واپس لوٹا اور انھیں اپنے جسم میں تیر لگنے کی خبر ہوئی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انہیں زیادہ تکلیف کا احساس ہونے لگا تھا، بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ انھیں خیال ہوا کہ جو ذمہ داری انھیں سونپی گئی ہے، کہیں وہ ان کے مسلسل خاموش رہنے اور ان کی جان چلی جانے سے فوت نہ ہو جائے۔اسی احساس نے انھیں مجبور کیا کہ وہ جلدی سے نماز پوری کر کے اپنے ساتھی کو بیدار کر دیں، تاکہ گھاٹی کے ناکے کی حفاظت کی جو امانت ان کے سپرد تھی وہ اس کے حوالے کر دیں۔ ۳۱؎

سرکاری اہل کاروں کے لیے یہ احساس رکھنا لازمی ہے کہ مناصب اور ذرائع کو دنیاوی آرزوؤں کے حصول کے لیے ناجائز استعمال نہ کریں، بلکہ مفوّضہ ذمہ داریوں کو مذہبی، قومی اور اخلاقی فریضہ سمجھ کر ادا کریں۔

حواشی ومراجع

۱؎ غازی، محمود احمد، محاضراتِ سیرت، الفیصل ناشرانِ کتب لاہور، ۲۰۰۹ئ، ص ۳۴۵

۲؎ نعمانی، علامہ شبلی، سیرت النبی، ادارہ اسلامیات لاہور، ۲۰۰۲ئ، ج ۲، ص ۴۰۸

۳؎ الجوزیہ، محمد بن ابوبکر ابن القیم، مختصر زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، ترجمہ عبدالرزاق ملیح آبادی، اہل سنت پبلیشرز لاہور، ۲۰۰۱ئ، ص ۵۷

۴؎ محاضرات سیرت، ص ۳۲۸

۵؎ المستدرک علی الصحیحین، ج ۳، ص ۶۶

۶۔ داناپوری،عبدالرؤف، اصح السیر ، ادارہ اسلامیات لاہور،۲۰۰۹ئ ص۳۰۶
۷۔ محمد حمیداللہ، ڈاکٹر،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکم رانی اور جانشینی،بیکن بکس لاہور،۲۰۱۱ئ،ص ۹۲
۸۔ محمد حمیداللہ، ڈاکٹر،محمد رسول اللہ، ترجمہ خالد پرویز،بیکن بکس لاہور، ۲۰۰۵ئ، ص۲۰۹
۹۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم ، ۲۴۴۳،صحیح مسلم، ۲۵۸۰
۱۰۔ سنن أبی داؤد، کتاب الادب، باب فی النصیحۃ ، ۴۹۴۴
۱۱۔ الازھری، پیر محمد کرم شاہ، ضیا النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، ضیاء القران پبلی کیشنز لاہور،۱۹۹۹ئ، ج ۵،ص ۲۷۹
۱۲۔ گوہر رحمان ،مولانا، اسلامی سیاست ،مکتبہ تفہیم القرآن مردان، ۲۰۰۲ئ،ص ۱۴۰
۱۳۔ سنن ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، باب فی القیامۃ، ۲۴۱۷
۱۴۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامام العادل، ۱۸۲۸
۱۵۔ المعجم الکبیر
۱۶۔ سنن الترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی المداراۃ، ۱۹۹۶ء
۱۷۔ سنن أبی داؤد، کتاب الاقضیۃ، باب فی کراھیۃ الرشوۃ، ۳۵۸۰؛سنن ترمذی، ۱۳۳۷
۱۸۔ طبری،محمد بن جریر، تفسیر الطبری، ھجر للطباعہ والنشر ، قاہرہ، ۲۰۰۱ئ، ج۷،ص ۱۷۳
۱۹۔ قرطبی،محمد بن احمد،الجامع لأحکام القرآن،مؤسسۃ الرسالۃ بیروت،۲۰۰۶ئ،ج۶،ص ۴۲۳
۲۰۔ ابن کثیر،عماد الدین،تفسیر ابنِ کثیر،مکتبہ قدوسیہ لاہور ، ۲۰۰۶ئ، ج۵،ص ۶۲۲
۲۱۔ محمد شفیع،مفتی ،معارف القرآن، ادارۂ معارف کراچی، ۲۰۰۵ئ ، ج ۲،ص ۴۴۶
۲۲۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب رفع الامانۃ، ۶۴۹۶
۲۳۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، ۱۸۲۵
۲۴۔ السنن الکبریٰ للبیہقی: ۲۰/ ۱۶۸
۲۵۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان ، ۱۰۲
۲۶۔ المعجم الکبیر للطبرانی ، ج۱۹،ص ۲۷۴

۲۷۔ غازی، محمود احمد، ادب القاضی، ادارہ تحقیقات اسلامیہ اسلام آباد، ۱۹۹۳ئ، ص ۳۷۵
۲۸۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، البدور البازغۃ، ترجمہ قاضی مجیب الرحمن، وزارتِ مذہبی امور اسلام آباد، ۱۹۸۱ئ، ص ۲۰۲
۲۹۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول، ۷۱۳۸
۳۰۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سیرت سرور عالم، ادارہ ترجمان القران لاہور، ۲۰۰۹ئ، ج ۲، ص ۱۷۰
۳۱۔ البوطی، محمد سعید رمضان، دروس سیرت، ترجمہ محمد رضی الاسلام ندوی، نشریات لاہور، ۲۰۱۰ئ، ص ۳۷۲

☆☆☆

مطالعہ وتحقیق اور تصنیف وتالیف کے شائقین کے لیے سنہری موقع

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ میں دوسالہ تصنیفی تربیت کورس کے لیے ایسے یکسو اسکالرس کی ضرورت ہے جو:

☆ مطالعہ وتحقیق اور تصنیف وتالیف کا ذوق وشوق رکھتے ہوں۔
☆ امت کی فکری رہ نمائی اور اپنے علمی ارتقاء کے خواہش مند ہوں۔
☆ عربی، انگریزی اور اسلامیات کی اچھی استعداد رکھتے ہوں۔

اس کورس کے امیدوار کے لیے ضروری ہے کہ وہ:

☆ کسی معروف عربی درس گاہ سے فضیلت یا اس کی مساوی سند کے حامل ہو یا کسی کالج ویونی ورسٹی سے گریجویٹ ہو۔
☆ اس کی عمر ۲۵/سال سے زائد نہ ہو۔

منتخب طلبہ کو ادارہ کے خوب صورت اور وسیع کیمپس میں قیام کی سہولت کے ساتھ پانچ ہزار روپے ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔

خواہش مند طلبہ درخواست کے ساتھ اپنے کوائف مع اسناد کی نقول اس طرح ارسال کریں کہ ۱۵/ مارچ ۲۰۱۵ء تک ادارہ کو موصول ہوجائے۔ جن افراد کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا انھیں دونوں طرف کا سلیپر کلاس کا کرایہ دیا جائے گا۔

نوٹ: ادارہ کے مختلف علمی وتحقیقی منصوبوں کی تکمیل کے لیے اہل خیر سے دعاؤں، مشوروں اور مالی تعاون کی درخواست ہے۔

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی
سکریٹری ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، نبی نگر، جمال پور، علی گڑھ
Mob:9410060558

ابنِ سیّد الناس اور ان کی کتابِ سیرت

حافظہ صبیحہ منیر

نام ونسب

ابن سید الناس کا نام محمد بن محمد بن محمد بن احمد بن سیدا لناس ہے۔حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) نے اُن کا تفصیلی نسب نامہ یوں ذکر کیا ہے:

''أبو الفتح فتح الدين محمد بن محمد بن محمد بن أحمد بن عبداللہ بن يحىٰ بن محمد بن أبى القاسم بن محمدبن محمدبن عبدالعزيز بن سيد الناس بن أبى الوليدبن منذر بن عبد الجبار بن سليمان اليعمرى الربعى، الاشبيلى الأندلسى، المصرى القاهرى، الشافعى المعروف بابن سيدالناس۔'' [۱]

اُن کا لقب 'فتح الدین' اور کنیت 'ابوالفتح اور ابنِ سیّد الناس' ہے۔ابوالفتح کی کنیت کی وجہ بیان کرتے ہوئے ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

كنّاه بها شيخه المسند عبد اللطيف بن عبدالمنعم بن على المعروف بالنجيب الحرانى۔۔۔ حين أحضره والده اليه فى مجلس الحديث۔ [۲]	ابنِ سیّد الناس کی یہ کنیت اُن کے شیخ عبدالطیف بن عبدالمنعم نے، جو کہ نجیب حرانی کے نام سے مشہور تھے، اُس وقت رکھی جب اُن کے والد اُن کو شیخ کی مجلسِ حدیث میں لائے۔

'الیعمری' قبیلہ یعمر کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔

امام سمعانیؒ (م ۵۶۲ھ) قبیلہ یعمر کے بارے میں لکھتے ہیں:

یعمری نسبۃ الیٰ بطن من کنانہ۔۳؎	یعمری قبیلۂ کنانہ کی شاخ کی جانب منسوب ہے۔

'الربعی' کی نسبت کے بارے میں ابن الأثیرؒ (م ۶۳۰ھ) لکھتے ہیں:

ربعی نسبۃ الیٰ ربیعۃ بن نزار او ربیعۃ بن الأزد أو ربیعۃ الجوع أو ربیع بن مالک بن عمرو أو ربیع بن حصن بن ضمضم۔۴؎	ربعی کی نسبت ربیعہ بن بزار یا ربیعہ بن ازد یا ربیعہ الجوع یا ربیع بن مالک یا ربیع بن حصین کی طرف ہے۔

یہاں ربعی کی نسبت 'ربیعہ بن نزار' کی طرف ہے۔

ابتدائی حالات

ابنِ سیّد الناس نے اپنے تلمیذِ رشید صلاح الدین بن ایبک الصفدی (م ۷۶۴ھ) سے اپنی تاریخ پیدائش ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

مولدی فی رابع عشر ذی القعدۃ سنۃ ۶۷۱ھ۔بالقاھرۃ۔۵؎	میں ۱۴/ ذی القعدہ ۶۷۱ھ کو قاہرہ میں پیدا ہوا۔

تاج الدین السبکیؒ (م ۷۷۱ھ) طبقات الشافعیۃ الکبریٰ میں ابنِ سیّد الناس کی تاریخ پیدائش بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مولدُہٗ فی ذی الحجۃ، سنۃ احدی وسبعین وستمائۃ۔۶؎	ان کی پیدائش ذی الحجۃ ۶۷۱ھ میں ہوئی۔

امام شوکانیؒ (م ۱۲۵۰ھ) نے ابنِ سیّد الناس کا نسب نامہ ذکر کرتے ہوئے، ان کے گیارہویں جد کا نام 'ابی القاسم بن محمد' ذکر کیا ہے، جب کہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے بیان کردہ نسب نامہ میں 'محمد بن ابی القاسم' ہے۔

تعلیم وتربیت

ابنِ سیّد الناس ایک علمی گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے دادا اور والد محدث اور اعلیٰ پائے کے عالم تھے۔ اس وجہ سے اُن کی تربیت خالص علمی ماحول میں

ہوئی۔لڑکپن میں ہی اپنے والد کے ساتھ شیوخ کی مجالس میں حاضر ہونے لگے اور مختلف مشائخ سے اجازت اور سماع کا موقع ملا۔

۱۴ سال کی عمر میں باضابطہ شرفِ تلمذ کے حصول کے لیے مختلف مشائخ کے علمی حلقوں کا رُخ کیا، جہاں کتابتِ حدیث، سماعِ حدیث اور زمانہ کے مروجہ علوم وفنون حاصل کیے۔حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں:

ولم يقتصر من جهة أخرى على تحصيل الحديث وعلومه،فاتّجة الى دراسة الفقه وأصوله، وحفظ فى ذلک بعض المتون فى الفقه الشافعى، كالتنبيه۔۔۔ وأخذ النحو عن الشيخ بهاء الدين بن النحاس۔۷؎

حدیث اور اس کے متعلقات کے حصول کی وجہ سے دوسرے علوم کے تحصیل میں کمی نہیں آنے دی۔فقہ اور اصول فقہ کی جانب متوجہ ہوئے اور فقہ شافعی کی بعض کتب کے متون جیسے 'تنبیہ' کو یاد کیا۔۔۔نحو میں کامل دست رس شیخ بہاء الدین بن النحاس کے پاس رہ کر حاصل کی۔

سماعِ حدیث اور اجازتِ حدیث کے لیے مختلف علاقوں کا سفر کیا۔ بالآخر ایک وقت ایسا آیا کہ تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھانے کے لیے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور اُن کے فیض سے استفاہ کرنے لگے۔

اساتذہ

ابنِ سیّدالناس نے تحصیلِ علم کے لیے مملکتِ اسلامیہ کے مختلف علاقوں کا سفر کیا اور مختلف علماء اور مشائخ سے حدیث، فقہ، اصول فقہ،نحو اور دیگر علوم وفنون میں استفادہ فرمایا۔ حافظ ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ) سے اُن کے شیوخ کے بارے میں استفسار کیا گیا،تو انھوں نے فرمایا:

لعل مشيخته يقاربون الألف۔۸؎

شاید اُن کے مشائخ کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔

ابنِ سیّدالناس کے مشہور اساتذہ کے نام درج ذیل ہیں:

۱- عبدالطیف بن عبدالمنعم بن علی، المعروف بالنجیب الحرانی علیہ الرحمۃ

۲- الامام عزالدین أحمد بن ابراھیم الفارسی علیہ الرحمۃ

۳- أبوالقاسم الخضر بن أبی الحسین بن الخضر بن عبدان الأزدی الدمشقی علیہ الرحمۃ

۴- شامیۃ بنت الحافظ أبی علی الحسن بن محمد بن البکری، أمۃ الحق۔

۵- اسماعیل بن ابراھیم بن عبدالرحمن المخزومی، المعروف بابن قریش علیہ الرحمۃ

۶- أبوعبداللہ محمد بن مؤمن الصوری علیہ الرحمۃ

۷- الامام قطب الدین ابوبکر محمد بن أحمد القسطلانی علیہ الرحمۃ

۸- شمس الدین أبوعبداللہ محمد بن ابراھیم بن عبدالواحد المقدسی علیہ الرحمۃ

۹- الشیخ الغز عبدالعزیز بن الصیقل الحرانی علیہ الرحمۃ

۱۰- أبوعمرو محمد بن محمد بن سیدالناس علیہ الرحمۃ

۱۱- تقی الدین، أبوالفتح، محمد بن علی بن وھب بن مطیع القشیری، المالکی، الشافعی، المعروف بابن دقیق العید علیہ الرحمۃ

۱۲- ابوعبداللہ، محمد بن ابراھیم بن محمد بن ابی نصر، بھاء الدین بن النحاس علیہ الرحمۃ الحلبی، النحوی

ان کے علاوہ انھوں نے ابوالانماطی، غازی الحلاوی، ابن الخیمی، ابن الخطیب المزۃ، ابن الفتح بن المجاور، ابن عساکر، أبوالاسحاق الواسطی، القاضی أبوالقاسم الحراستانی، الصوفی أبی عبداللہ بن البنائ، أبوالحسن بن البناء اور مصر، اسکندریہ، شام، حجاز اور اندلس کے علماء سے بھی اجازت اور سماع کا شرف حاصل کیا۔۹

معاصر شخصیات کی آراء

ابنِ سیّد الناس کو اُن کے معاصرین نے شان دار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اُن کو اعلیٰ درجہ کا محدث، فقیہ، حافظ، ادیب، فصیح وبلیغ شاعر اور علل رواۃ جاننے والا بتلایا ہے۔ ذیل میں چند حضرات کی آراء نقل کی جاتی ہیں: ابن شاکر الکتبی (م ۷۶۴ھ) حافظ ذہبیؒ کی رائے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

كان صدوقاً في الحديث، حجة في ماينقله۔ ۱۰	وہ حدیث میں سچے تھے اور جو کچھ انھوں نے بیان کیا ہے اس میں حجت تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی، ابن فضل اللہ کی رائے ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

كانَ أحد أعلام الحفاظ و امام أهل البلاغة الو اقفين بعكاظ بَحر مكثار وَحبر في نقل الاثار۔ ۱۱	وہ بڑے علماء اور حفاظ حدیث میں سے تھے، اہل البلاغۃ کے امام تھے۔ علم کا سمندر تھے۔ آثار کی روایت میں مہارت رکھتے تھے۔

تاج الدین السبکی علم الدین قاسم بن یوسف البرزالی کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

كان أحد الأعيان معرفةً و اتقاناًو حفظاً للحديث وتفهّماً في علله و أسانيده۔ ۱۲	حدیث کی معرفت، مہارت اور حفظ میں معروف ومشہور علماء میں سے ایک تھے اور احادیث کی علل واسانید کو خوب جاننے والے تھے۔

حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) فرماتے ہیں:

اشتغل بالعلم۔۔۔ ولم يكن في مصر في مجموعه۔ ۱۳	(ابنِ سیّد الناس) تعلیم وتعلم میں مشغول رہے۔۔۔ مصر میں اُن جیسا کوئی نہیں تھا۔

ابن العماد (م ۱۰۸۹ھ) ابن ناصر الدین کا قول نقل کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

كان اماماً، حافظاً ۔۔۔ بارعاً، شاعراً واديباً۔ ۱۴	(ابنِ سیّد الناس) وقت کے امام، حافظ، صالح، شاعر اور ادیب تھے۔

امام اسنوی (م ۷۷۲ھ) فرماتے ہیں:

حافظ الدیار المصریۃ۔۱۵ ابنِ سیّد الناس دیار مصر کے بڑے حافظ تھے۔

ابنِ سیّد الناس بہ حیثیت سیرت نگار

ابنِ سیّد الناس کو سیرت نگاروں میں نہایت اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے ممتاز محدثین میں ہوتا ہے۔ مگر سیرت نگار کی حیثیت سے وہ زیادہ مشہور ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب 'عیون الاثر' میں نبی کریم ﷺ کی سیرت کو مستند روایات کی روشنی میں بیان کیا ہے، جس میں آں حضرت ﷺ کے شمائل و عادات، سیرت کے اہم واقعات اور غزوات کا مفصل ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کا شمار فنِ سیرت کی نہایت جامع اور معتبر و مستند کتاب میں ہوتا ہے۔ مؤلف نے کتاب کا آغاز نبی کریم ﷺ کے نسب نامہ سے کیا اور بعد کے اہم واقعات کو بیان کر کے غزواتِ رسول ﷺ کا تذکرہ کیا ہے۔ سرور عالم ﷺ کی وفات کے ذکر سے قبل آپؐ کے فضائل و شمائل اور عادات، رشتہ داروں اور آپؐ کے استعمال میں رہنے والی اشیاء کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے سیرت کے سابقہ ذخیرہ کو سامنے رکھتے ہوئے ان کا اختصار پیش کیا ہے اور بقدر ضرورت اس میں اضافہ بھی کیا ہے۔

عیون الاثر کا منہج و اسلوب

آٹھویں صدی ہجری کی کتبِ سیرت میں 'عیون الاثر' ممتاز درجہ کی حامل ہے۔ کتاب کا مکمل نام 'عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر' ہے۔ یہ کتاب نبی کریم ﷺ کی عادات و معمولات، فضائل و شمائل اور غزوات کے بیان، مختلف سیرت نگاروں کی آراء و اقوال کو جاننے اور اعلام و انساب کی وضاحت کے سلسلے میں بنیادی مأخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ مصنف نے کتاب کو ابواب اور فصول میں تقسیم نہیں کیا ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کے تمام اہم واقعات کو 'ذکر نسب سیدنا و نبینا رسول ﷺ

۔۔۔۔ ذکر مولد رسول اللہ ﷺ، ذکر تسمیۃ محمد و أحمد ﷺ الخ'' جیسے عناوین کے تحت واقعات کے تمام اجزاء کو مفصل بیان کیا ہے۔

بنیادی طور پر یہ کتاب مضامین کے اعتبار سے تین حصوں پر منقسم ہے:

۱۔ مضامینِ سیر

۲۔ مضامینِ غزوات

۳۔ مضامین فضائل وشمائل

ابن اسحاق اور امام واقدی پر کلام

ابنِ سیّد الناس نے سیرت اور مغازی کے بنیادی رواۃ 'امام ابن اسحاق اور واقدی'' پر کتاب کے مقدمہ میں مفصل کلام کیا ہے۔ انھوں نے ان حضرات کے بارے میں اہل سیر کے بیانات کے ساتھ ان پر ہونے والے اعتراضات کا بھی جائزہ لیا ہے اور یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ ان کے کلام پر اعتبار کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ سیرت نبوی ﷺ کی معلومات کے سلسلے میں بعد کے تمام مؤلفین ان حضرات کے محتاج ہیں، نیز ان کی بیان کردہ روایات میں ایسی کوئی بات نہیں جو احادیثِ صحیحہ کے منافی ہو۔ مشہور اسکالر ڈاکٹر محمود احمد غازی 'ابن سید الناس' کے اس محاکمہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''انہوں نے محاکمہ کرنے کے بعد نتیجہ نکالا کہ اُن دونوں کے بیانات بالکل مستند ہیں ۔۔۔ یہ معلومات سیرت کے عمومی اسٹرکچر میں جہاں جہاں خلا ہے، اُس کی تکمیل کرتی ہیں اور ایسی کوئی چیز نہیں جو تحقیق کی میزان پر پوری نہ اُترتی ہو۔''[۱۶]

ابن اسحاق اور واقدی کی 'عدالت' پر اتنا مفصل کلام ابنِ سیّد الناس کی کتاب 'عیون الاثر' کے علاوہ سیرت کی کسی اور کتاب میں نہیں ملتا۔ ان کے بارے میں منفی اور مثبت آرا کے جائزہ کے بعد ابن سید الناس اُن کی تصویب کے قائل ہیں اور اُن کی بیان کردہ معلومات پر اعتماد کو درست قرار دیتے ہیں۔

اسلوبِ تحریر

ابنِ سیّدالناس نے 'عیون الاثر' میں قاری کی سہولت کے لیے واقعات کا زمانی ترتیب سے ذکر کیا ہے۔ انھوں نے سیرت طیبہ کے اہم پہلوؤں کو عنوانات کے تحت بیان کرتے ہوئے کلام اور واقعہ کی مناسبت سے اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ انھوں نے اپنے زمانہ کے دستور کے مطابق مسجع و مقفّٰی کلام کے بجائے اپنی بات کو نہایت ہی سادہ، بے تکلف اور سیدھے سادہ انداز میں پیش کیا ہے۔

محقق محی الدین مستو لکھتے ہیں:

لم يثقل كتابه بأسلوب السجع والمحسنات الذى كان سائداً فى عصره، بل أطلق عبارته من كل قيد۔۱۷	انہوں نے ایسے بناوٹ اور تکلف کے اسلوب کے ذریعے اپنی کتاب کو دشوار نہیں بنایا جو اُن کے زمانہ میں عام طور پر جاری تھا، بلکہ اپنی کتاب کی عبارتوں کو ہر قسم کے قید سے آزاد رکھا۔

ابن سیدالناس کی حیات میں ہی 'عیون الاثر' کو لوگوں میں پذیرائی حاصل ہو چکی تھی۔ بعد کے سیرت نگاروں نے اس کتاب کی افادیت کے پیشِ نظر اُس کو نظم ونثر اور تلخیص وتشریح کے ذریعے عوام کی خدمت میں پیش کیا۔

اسانید

ابنِ سیّد الناس نے 'عیون الاثر' کو محدثانہ طرز پر مرتب کیا، مگر قاری کو اکتاہٹ سے بچانے کے لیے انھوں نے اسناد کا بار بار ذکر نہیں کیا، بلکہ جن کتب کو مدنظر رکھ کر کتاب کی تالیف کی اُن کی اسناد کو کتاب کے آخر میں جمع کر دیا ہے۔ اس بات کا تذکرہ مصنف نے کتاب کے مقدمہ میں صراحت سے کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

أذكر أسانيدى الى مصنّفى تلك الكتب فى مكان واحد عند انتهاء الغرض من هذا المجموع۔۱۸	اس مجموعہ کے آخر میں ایک ہی جگہ میں اپنی تمام اسناد کو، جن کے ذریعے یہ کتب مجھ تک پہنچی ہیں، ذکر کروں گا۔

مصنف نے یہ انداز صرف قارئین کی سہولت کے پیشِ نظر اپنایا ہے، تاکہ وہ اُکتاہٹ نہ محسوس کریں اور تمام واقعات اور حالات مستند مآخذ کے ذریعہ ان تک پہنچ سکیں۔

شرکائے واقعات سیرت کے اسماء کی تفصیل کا اہتمام

واقعات کی تفصیل کے ذیل میں اُن میں شریک صحابہ کرام اور دیگر لوگوں کے اسماء کی وضاحت کرتے ہیں۔ ناموں کے وضاحت کے دوران اس سلسلہ میں پائے جانے والے اختلاف کا بھی ذکر کرتے اور غلط رایوں کی تردید کرتے ہیں۔ جیسے غزوۂ احد کے دوران شہید ہونے والوں کے اسماء درج کرتے ہوئے علامہ ابن عبدالبر کا قول نقل کیا کہ اُن (علامہ ابن عبدالبر) کے نزدیک خنیس بن حذافہ بن قیس بن عدی اسی غزوہ میں شہید ہوئے تھے۔ اس پر مؤلف لکھتے ہیں:

ولیس ذلک بشیء، والمعروف أنه مات بالمدینة علی رأس خمسة وعشرین شهراً بعد رجوعه من بدر، وتأیمت منه حفصة بنت عمر فتزوّجها رسول الله ﷺ فی شعبان علی رأس ثلاثین شهراً کماسیأتی ان شاء الله تعالی، وکل ذلک قبل أحد۔۱۹	اس بات کی کوئی حقیقت نہیں۔ مشہور یہ ہے کہ وہ غزوۂ بدر سے لوٹنے کے بعد مدینہ منورہ میں (ہجرت مدینہ کے) ۲۵ ماہ کی ابتدا میں فوت ہوئے اور حضرت حفصہ بنت عمرؓ، جو ان کے نکاح میں تھیں، بیوہ ہوئیں تو نبی کریم ﷺ نے (ہجرت مدینہ کے) تیسویں ماہ کے شروع میں شعبان میں اُن سے نکاح کیا۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔ یہ تمام واقعات غزوۂ احد سے قبل رونما ہوئے۔

اختلافی آراء کا تذکرہ اور جزوی تفصیلات

اس کتاب میں ناموں کے درست تلفظ، اُن کے نسب ناموں میں پائے جانے والے اختلاف اور مختلف واقعات میں شریک حضرات کے بارے میں پائے

جانے والے اختلاف کی وضاحت کثرت سے ملتی ہیں۔ ابنِ سیّد الناس اعلام واماکن میں پائے جانے والے ابہام اور وہم کو دور کرنے اور ناموں کی وضاحت میں اپنی رائے کو حتمی قرار نہیں دیتے، بلکہ قاری کو راجح رائے اختیار کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ جیسے غزوۂ ذات الرقاع کو ذات الرقاع کیوں کہا جاتا ہے؟ اس سے متعلق مختلف اقوال نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

غزوة ذات الرقاع، وسمّيت بذلك لأنهم رقعوا فيها رأياتهم، ويقال: ذات الرقاع شجرة بذلك الموضع، وقيل: لأن أقدامهم نقيت، فكانوا يلفّون عليها الخرق، وقيل: بل الجبل الذى نزلوا عليه كانت أرضه ذات ألوان تشبه الرقاع۔۲۰۔

اس غزوہ کو ذات الرقاع اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں صحابہ کرام نے اسی مقام پر اپنے جھنڈے گاڑے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذات الرقاع اس جگہ کے ایک درخت کا نام ہے۔ایک قول یہ ہے کہ اس غزوہ میں صحابہ کے پیروں میں آبلے پڑ گئے تھے، چنانچہ انھوں نے ان پر پٹیاں باندھ لی تھیں، اس وجہ سے اس غزوہ کو ذات الرقاع کا نام دیا گیا۔ اس کی ایک وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس موقع پر صحابہ نے جس پہاڑ پر پڑاؤ ڈالا تھا اس کی زمین رنگ برنگی تھی۔

ابنِ سیّد الناس نے تمام اقوال درج کر دیے ہیں، لیکن کسی بھی رائے کو ترجیح نہیں دی ہے۔

آیاتِ قرآنی کا استعمال

ابنِ سیّد الناس کبھی واقعاتِ سیرت سے پہلے موضوع سے متعلق قرآنی آیات کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کا مقصد سیرت نبوی کو قرآن کریم کا آئینہ قرار دینا ہے۔ جیسے سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اخلاق کے بیان میں لکھتے ہیں:

قال اللہ تعالی (وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ) ۔۲۱۔

''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یقیناً آپؐ اخلاق کے عظیم مرتبہ پر فائز ہیں۔''

تاریخوں کا اہتمام

ابنِ سیّد الناس واقعات کی تاریخ سے متعلق پائے جانے والے اختلاف کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ جیسے غزوہ بنونضیر کس تاریخ میں واقع ہوا؟ اُس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وهی عند ابن اسحق: فی شهر ربیع الأول علی رأس خمسة أشهر من وقعة أحد، وقال البخاری: قال الزهری عن عروة: کانت علی رأس ستة أشهر من وقعة بدر، قبل أحد۔ ۲۲؎

ابن اسحاق کے نزدیک غزوۂ بنونضیر غزوۂ احد کے واقعہ کے بعد پانچویں مہینہ (ربیع الاول) کی ابتدا میں ہوا۔ امام بخاری نے کہا: زہری عروہ بن الزبیر کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ غزوۂ بنونضیر غزوۂ بدر کے بعد چھٹے مہینہ میں غزوۂ احد سے پہلے پیش آیا۔

واقعاتِ سیرت کے اسباب و وجوہ کا تذکرہ

ابنِ سیّدالناس کسی واقعہ سے متعلق پائے جانے والے مختلف اسباب پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ جیسے غزوۂ مؤتہ کیوں پیش آیا؟ اس کی وجہ ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

وکان سببها أن رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم بعث الحارث بن عمیر الأزدی أحد بنی لهب بکتابه الی الشام الی ملک الروم، وقیل: الی ملک بصری، فعرض له شرحبیل بن عمرو الغسانی فأوثقه رباطاً ثم قدم فضرب عنقه صبراً، ولم یقتل لرسول الله ﷺ رسول غیره، فاشتد ذلک علیه حین بلغه الخبر عنه۔ ۲۳؎

غزوۂ موتہ کا سبب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حارث بن عمیر ازدیؓ کو، جو کہ بنولہب سے تعلق رکھتے تھے، ملک روم کے نام خط کے ساتھ شام کی جانب بھیجا۔ بعض کے نزدیک ملک بصریٰ کے نام خط دے کر بھیجا تھا۔ وہ یہ خط لے کر نکلے تو انھیں شرحبیل بن عمرو غسانی نے گرفتار کر لیا اور انھیں رسیوں میں جکڑ کر شہید کر دیا۔ ان کے علاوہ نبی کریم ﷺ کے کسی قاصد کو شہید نہیں کیا گیا۔ جب آپؐ کو اس واقعہ کی خبر ملی تو آپؐ سخت ناراض ہوئے۔

مختلف فیہ اقوال میں ترجیح

بعض مرتبہ ابنِ سیّد الناس کسی مختلف فیہ مسئلہ میں کسی ایک قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ جیسے حدیث المعراج کے ذیل میں انھوں نے اس اختلاف کا ذکر کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج کے موقع پر آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی رؤیت آنکھوں کے ذریعے ہوئی تھی یا نہیں؟ حضرت عائشہ صدیقہؓ اس کا انکار کرتی ہیں، جب کہ حضرت ابن عباسؓ اس کے قائل ہیں۔ابنِ سیّد الناس نے حضرت ابن عباسؓ کے قول کو ترجیح دی ہے۔اس پر یہ اعتراض ہوسکتا تھا کہ قرآن کریم میں تو رؤیۃ بالابصار کی نفی کی گئی ہے۔اس اعتراض کو دور کرتے ہوئے ابنِ سیّد الناس رقم طراز ہیں:

قلت: وقوله تعالىٰ: (لَاتُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ) لا يعارض هذه، لأنه لا يلزم من الرؤية الادراک۔ ۲۴

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''اللہ تعالیٰ کی ذات کا 'ادراک' آنکھوں سے ممکن نہیں'' (حضرت ابن عباسؓ کے) اس قول کے منافی نہیں۔اس لیے کہ دیدار سے ادراک (یعنی مکمل احاطہ) لازم نہیں آتا۔

اشعار کا استعمال

بعض مرتبہ کسی لفظ کے معنیٰ کی وضاحت میں ابنِ سیّد الناس بطور دلیل اشعار کا بھی ذکر کرتے ہیں مثلاً:

وقدح من عيدان مفتوح العين المهملة ساكن الياء آخر الحروف۔ والعيدان النخلة السحوق۔ قال الشاعر:

لکڑی کا پیالہ۔لفظ عیدان میں عین زبر اور یا کے سکون کے ساتھ پڑھا جائے گا۔عیدان لمبے کھجور کے درخت کے تنے کو کہا جاتا ہے۔ جیسے شاعر کہتا ہے:

ان الرياح اذا ما عصفت قصفت
عيدان نجد ولم يعبأن بالرتم۔ ۲۵

''بے شک ہوائیں جب تندوتیز ہوتی ہیں تو وہ نجد کے لمبے کھجور کے درختوں کو اُکھاڑ دیتی ہیں اور اُن کے مضبوط اور تناور ہونے کی پروانہیں کرتیں۔''

عیون الاثر کے بارے میں علما کی آراء

ابنِ سیّد الناس کی تالیف لطیف 'عیون الاثر' کی، اُن کے ہم عصر علماء اور متاخرین نے خوب تعریف کی ہے۔بعض حضرات نے اس کی شرحیں کی ہیں اور بعض نے اسے منظوم انداز میں پیش کیا ہے۔ ذیل میں کتاب کے بارے میں چند اہل علم کی آراءکو پیش کیا جاتا ہے:

حافظ تاج الدین السبکی لکھتے ہیں:

صنّف الشیخ فتح الدین کتاباً فی المغازی والسیر سمّاه عیون الأثر: أحسن فیه ماشاءَ۔۲۶

شیخ فتح الدین نے مغازی اور سیرت میں ایک کتاب تصنیف فرمائی، جس کا نام 'عیون الاثر' ہے۔ یہ بہت عمدہ تصنیف ہے۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

قد جمع سیرة حسنة فی مجلدین۔۲۷

اُنھوں نے دوجلدوں میں سیرت کے موضوع پر عمدہ کتاب تصنیف کی ہے۔

شمس الدین السخاوی (م ۹۰۲ھ) کتاب کی توصیف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ماأحسنه۔۲۸ (کیا ہی عمدہ کتاب ہے۔)

امام شوکانی (م ۱۲۵۰ھ) کتاب کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

له تصانیف: منها السیرة النبویة المشهورة، التی انتفع بها الناس من أهل عصره فمن بعدهم۔۲۹

اُن کی بہت سی تصانیف ہیں۔ اُن میں سے ایک سیرت نبوی پر مشہور کتاب ہے، جس سے اُن کے زمانے اور بعد کے لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔

الغرض ابنِ سیّد الناس کا سیرت میں بہت اہم مقام ہے۔ اُنھوں نے سیرت کے سابقہ کام کی تنقیح کر کے مختصر ومدلل طور پر سیرت النبی کو پیش کیا ہے۔ یہ کتاب

سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات زندگی، غزوات وسرایا اور شمائل، معجزات اور دلائل پر مشتمل ہے۔ واقعات کو منقح ومصفّٰی کر کے نہایت جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ یہ کتاب محدثانہ طرز پر تالیف کی گئی ہے۔ ان خوبیوں کی وجہ سے اس تالیف کو بعد کے ادوار میں بہت مقبولیت ملی۔ عیون الاثر کی سب سے مشہور شرح برہان الدین الحلبی المشہور بہ ابن العجمی کی کتاب 'نور النبراس فی شرح سیرۃ ابن سید الناس' ہے، جس کا کچھ حصہ شائع ہو چکا ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ ابن حجر عسقلانی، شہاب الدین احمد بن حجر، الدرر الکامنۃ فی أعیان المائۃ الثامنۃ، مجلس دائرہ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۹۷۲ئ، ۵/۴۷۶

۲۔ حوالہ سابق، ۵/۴۸۲

۳۔ السمعانی، ابو سعید عبدالکریم بن محمد بن منصور، الأنساب، دارالفکر، بیروت، ۱۴۰۹ھ/۱۹۹۸ئ، ۵/۶۹۹

۴۔ ابن الاثیر، عزالدین الجزری، اللباب فی تہذیب الأنساب، دارصادر، بیروت، س۔ن، ۲/۱۵۔۱۶

۵۔ الصفدی، صلاح الدین خلیل بن ایبک، الوافی بالوفیات، تحقیق: احمد الارناوط اور ترکی مصطفی، داراحیاء التراث بیروت، العربی، الطبعۃ الاولیٰ ۲۰۰۰ئ، ۱/۲۳۳

۶۔ السبکی، تاج الدین عبدالوہاب بن تقی الدین، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، تحقیق: عبدالفتاح محمد، داراحیاء الکتب العربی، بیروت، س۔ن، ۹/۲۶۹

۷۔ الدرر الکامنۃ، ۵/۴۷۷

۸۔ الشوکانی، محمد بن علی، قاضی، البدر الطالع بمحاسن من بعد قرن السابع، دارالکتب الاسلامی، قاہرہ، س۔ن، ۲/۲۵۰

۹۔ الدرر الکامنۃ، ۵/۴۷۸۔۴۷۹

۱۰۔ ابن شاکر الکتبی، محمد بن شاکر بن احمد،فوات الوفیات، دارصادر، بیروت، ۱۹۷۴ئ، ۳/ ۲۸۸

۱۱۔ الدرر الکامنة، ۵ /۴۷۷

۱۲۔ طبقات الشافعیة الکبری،۹ / ۲٦۹

۱۳۔ ابن کثیر، عماد الدین محمد بن اسماعیل،البدایة و النهایة،دار احیاء التراث، بیروت، ۱۹۸۸ئ، ۱۴ / ۱٦۹

۱۴۔ ابن العماد، ابوالفلاح عبدالحی بن احمد، شذرات الذهب فی أخبار من ذهب، دار ابن کثیر، بیروت، الطبعة الاولی، ۱۹۹۴ئ، ۸ / ۱۹۰

۱۵۔ الاسنوی، جمال الدین عبدالرحیم، طبقات الشافعیة، دارالکتب العلمیة ، بیروت، الطبعة الاولی ۱۹۸۷ئ، ۱/ ۱۸۷

۱٦۔ محمود احمد غازی، ڈاکٹر، محاضرات سیرت، الفیصل ناشران کتب، لاہور، ستمبر ۲۰۱۲ئ، ص۲۱۸۔۲۱۹

۱۷۔ محی الدین مستو، مقدمہ عیون الاثر، ۱ / ۱۴

۱۸۔ ابن سید الناس، محمد بن محمد، عیون الأثر فی فنون المغازی و الشمائل و السیر، دار ابن کثیر، بیروت، ۱۹۹۲ئ، ۱/ ۵۳

۱۹۔ حوالہ سابق، ۲ / ۴۳

۲۰۔ حوالہ سابق، ۲/ ۷۹

۲۱۔ حوالہ سابق، ۱/ ۴۳۴

۲۲۔ حوالہ سابق، ۲ / ۷۳

۲۳۔ حوالہ سابق، ۲ / ۲۰۸

۲۴۔ حوالہ سابق، ۱/ ۲۵۱

۲۵۔ حوالہ سابق، ۲ / ۴۱۹

۲٦۔ طبقات الشافعیة الکبری، ۹ /۲٦۹

۲۷۔ البدایۃ النھایۃ، ۱۴/۱۶۹

۲۸۔ السخاوی، محمد بن عبدالرحمن بن محمد، الاعلان بالتوبیخ لمن ذم أھل التاریخ، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۹۸۶ئ، ص ۱۴۹

۲۹۔ البدرالطالع، ۲/۲۶۰

☆☆☆

اکیسویں صدی کے سماجی مسائل اور اسلام

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

اکیسویں صدی عیسوی میں جہاں سائنسی ایجادات اور تمدنی ترقیات کے نتیجے میں سفر وحضر کی سہولیات پیدا ہوئی ہیں اور انسانی زندگی پُرتعیش ہوئی ہے، وہیں بہت سے ایسے سماجی اور اخلاقی مسائل بھی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جن سے دنیا فتنہ و فساد سے بھی گئی ہے۔ نکاح کے بغیر جنسی تعلق، جنسی بے راہ روی وزنا کاری، رحمِ مادر کا اجرت پر حصول، ہم جنسیت، مصنوعی طریقۂ تولید، اسپرم بینک، رحمِ مادر میں بچیوں کا قتل، گھریلو تشدد، اولڈ ایج ہوم، پلاسٹک سرجری اور عام تباہی کے اسلحہ کا استعمال، چند ایسے مسائل ہیں جن سے انسانی معاشرے عالمی سطح پر دو چار ہیں۔

اس کتاب میں ان مسائل پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے، ان کے اسباب اور اثرات ونتائج کا بھرپور تجزیہ کیا گیا ہے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا حل پیش کیا گیا ہے۔

جدید ترین مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر پیش کرنے والی کتاب۔

آفسیٹ کی حسین طباعت، صفحات: ۲۵۶، قیمت: ۱۴۰ روپے

=※ ملنے کے پتے ※=

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۲

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

ترجمہ وتلخیص

مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۂ فیل
ایک تنقیدی جائزہ

شیخ عبدالرحمن بن یحییٰ المعلّمی الیمانی
مترجم: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

مولانا حمیدالدین فراہیؒ (۱۸۶۳ـ۱۹۳۰ئ) کی جلالتِ علمی، مختلف علوم وفنون میں مہارت اور خاص طور پر تفسیر وعلوم قرآنی میں گہری نظر کے باوجود ان کے بعض تفردات سے اہلِ علم نے اتفاق نہیں کیا اور ان پر جرح وتنقید کی ہے۔ ان کی تحریروں میں سب سے زیادہ تفسیر سورۂ فیل ہدفِ تنقید بنی ہے۔ اس تفسیر میں مولانا نے یہ نقطۂ نظر پیش کیا تھا کہ شاہِ یمن ابرہہ جب خانۂ کعبہ ڈھانے کے ارادے سے اپنے لاؤلشکر کے ساتھ آیا تھا تو اہلِ مکہ نے مقابلہ سے پہلو تہی نہیں کی تھی، بلکہ ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا تھا اور اس پر پتھروں کی بارش کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر زبردست آندھی مسلّط کردی تھی، جس سے پورا لشکر ہلاک ہوگیا تھا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کی لاشوں کو کھانے کے لیے پرندے بھیجے تھے۔ اس نقطۂ نظر پر جن حضرات نے نقد کیا تھا ان میں مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی (قصص القرآن، جلد سوم) اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (تفہیم القرآن، جلد ششم) مشہور ہیں۔ حال میں (۱۴۳۴ھ) اس پر ایک ناقدانہ تحریر عربی زبان میں شیخ علامہ عبدالرحمن بن یحییٰ المعلّمی الیمانی (م ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ئ) کے قلم سے شائع ہوئی ہے۔

شیخ معلّمی کی ولادت یمن میں ۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۵ئ میں ہوئی۔ وہیں انھوں نے تعلیم کے مراحل طے کیے، یہاں تک کہ انھیں شیخ الاسلام کے لقب سے نوازا گیا۔ ۱۳۴۵ھ/ میں وہ ہندوستان آگئے تھے، جہاں ۱۳۷۱ھ/ تک ربع صدی سے زائد عرصہ دائرۃ المعارف العثمانیۃ حیدرآباد سے وابستہ رہے۔ ان کے ذمے حدیث وتاریخ کی کتابوں کی تحقیق وتصحیح کا کام تھا۔ اس کے بعد وہ واپس مکہ مکرمہ چلے گئے، جہاں انھیں مکتبۃ الحرم المکی کا ذمہ دار

بنا دیا گیا۔ انھوں نے متعدد امہات الکتب کی تحقیق کی ہے، جن میں ابن ماکولا کی الاکمال اور سمعانی کی الانساب مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی متعدد طبع زاد تصانیف بھی ہیں۔

اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کے ایک منصوبے کے تحت شیخ المعلّمی کی تمام تصانیف تحقیق و تدوین کے بعد شائع کی جارہی ہیں۔ اسی کے تحت ان کی مذکورہ کتاب **رسالة فی التعقیب علی تفسیر سورة الفیل للمعلّم عبدالحمید الفراهی** کے نام سے شائع کی گئی ہے۔ اس کی تحقیق کی خدمت ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی نے انجام دی ہے۔

مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ فیل ان کی وفات کے بعد ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ ان دنوں شیخ عبدالرحمن المعلّمی حیدرآباد میں تھے۔ اس تفسیر پر ان کا رد دو حصوں میں ہے۔ پہلے حصے میں انھوں نے تفسیر فراہی پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور دوسرے حصے میں مذکورہ سورہ کی خود تفسیر کی ہے۔ یہ کتاب قیمتی تفسیری مباحث پر مشتمل ہے۔ ذیل میں اس کے منتخب حصوں کا ترجمہ تلخیص کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔ (رضی الاسلام)

میں نے علامہ محقق المعلّم عبدالحمید فراہی کی بعض تصانیف مثلاً **إمعان فی أقسام القرآن، الرأی الصحیح فی من هو الذبیح** اور تفسیر سورۂ شمس کا مطالعہ کیا ہے اور ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کتابوں سے مؤلف کی عبقریت کا اظہار ہوتا ہے۔ حال میں مجھے ان کی 'تفسیر سورۂ فیل' کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس میں بھی ان کا یہ وصف نمایاں ہے کہ اگر ان کے سامنے کوئی دلیل ہو تو اس کی بنیاد پر وہ برملا اختلاف کرتے ہیں۔ البتہ یہاں ان کا اختلاف کسی مشہور قول کے سلسلے میں نہیں ہے، بلکہ انھوں نے ایسی رائے کی مخالفت کی ہے، جس کے جمہور قائل ہیں اور پوری تاریخ میں کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے۔ ایسی متفق علیہ رائے کی مخالفت کے لیے محض اشارات اور قیاسات کافی نہیں ہیں، بلکہ انتہائی مضبوط اور قطعی دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ معلّم فراہی نے اپنی رائے کے حق میں جو دلائل پیش کیے ہیں، میں نے ان پر غور کیا تو ان کو اس معیار کا نہیں پایا۔ ذیل میں ان کا ایک جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

ابن اسحاق واقعۂ ابرہہ کی روایت میں منفرد نہیں ہیں

ابن اسحاقؒ نے بیان کیا ہے کہ ''ابرہہ نے صنعاء میں ایک عظیم الشان کنیسہ

تعمیر کیا، تاکہ لوگ حج کرنے کے لیے مکہ جانے کے بجائے وہاں آیا کریں۔ ایک شخص نے غصے میں آکر اس کنیسہ میں غلاظت کر دی۔ ابرہہ کو معلوم ہوا تو وہ سخت غضب ناک ہوا اور اس نے قسم کھا کر کہا کہ وہ اپنی فوج لے جا کر خانۂ کعبہ کو ڈھا دے گا''

معلّم فراہی نے اس واقعہ کا انکار کیا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ ''اس کی روایت ابن اسحاق نے کی ہے اور اہل فن کے نزدیک یہ امر طے شدہ ہے کہ وہ یہود اور غیر ثقہ راویوں سے روایت کرتے ہیں۔'' انھوں نے لکھا ہے کہ ''یہ تمام باتیں دشمنوں کی گھڑی ہوئی ہیں، ان میں عربوں کی غیرت وحمیت کی تحقیر کی گئی ہے اور ابرہہ کے لیے عذر تراشا گیا ہے''۔

اس روایت میں ابن اسحاق منفرد نہیں ہیں، بلکہ یہ واقدی اور ابن الکلبی سے بھی مروی ہے ا۔ پھر اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو عربوں کے لیے عیب ہو اور ابرہہ کے لیے وجہ جواز فراہم کرتی ہو۔ اس لیے کہ ایک شخص کی حرکت تمام عربوں کو مجرم نہیں بناتی اور اگر تمام اہل عرب نے کوئی قصور کیا ہوتا تو بھی اس کی بنا پر بیت اللہ کو ڈھانے کا جواز نہیں بنتا۔ البتہ یہ واقعہ روایت کے پہلو سے ثابت شدہ نہیں ہے۔

عبدالمطلب کا رویہ

ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ ''ابرہہ نے اہل مکہ کے سردار کو بلا بھیجا۔ عبدالمطلب اس کے پاس پہنچے تو ابرہہ نے ان کے ساتھ بڑے اعزاز واکرام کا معاملہ کیا۔ تختِ شاہی سے اتر کر فرش پر بیٹھ گیا اور ان کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ گفتگو شروع ہوئی تو عبدالمطلب نے کہا: میرے دو سو (۲۰۰) اونٹ آپ کے آدمی ہانک کر لے گئے ہیں، وہ مجھے واپس کر دیے جائیں''۔

معلّم فراہی نے لکھا ہے کہ ''ابرہہ عبدالمطلب کے ساتھ جس اخلاق سے پیش آیا تھا اس سے پوری امید بندھتی تھی کہ اگر وہ اس سے خانۂ کعبہ کے بارے میں کوئی خواہش کرتے تو وہ اس کو آسانی سے رد نہ کرتا۔ ایسی حالت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ چند

اونٹوں کے لیے تو اس سے درخواست کرتے، لیکن اصل معاملے کو بالکل ٹال جاتے''۔

واقعہ کی تفصیلات سے ایسی کوئی امید نہیں بندھتی تھی۔ ممکن ہے، عبدالمطلب نے محسوس کیا ہو کہ ابرہہ کے احترام ظاہر کرنے کا مقصد انہیں خانۂ کعبہ کے انہدام پر رضامند کرنا ہو۔ ممکن ہے، عبدالمطلب کو اللہ تعالیٰ پر غیر معمولی توکل ہو اور وہ ابرہہ سے خانۂ کعبہ کے بارے میں بات کرکے اس توکل کو مکدّر کرنا نہ چاہتے ہوں۔ ممکن ہے، وہ سمجھتے ہوں کہ خانۂ کعبہ کے بارے میں کوئی بات نہ کرنے سے ابرہہ پر خوف اور رعب طاری ہوجائے گا۔ واقعہ کے بعض بیانات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس میں ہے کہ ابرہہ نے عبدالمطلب سے کہا: ''میں اس گھر کو ڈھانے آیا ہوں جسے تم اور تمھاری قوم محترم سمجھتی ہے۔ حیرت ہے کہ تم نے مجھ سے اپنے اونٹوں کے بارے میں تو بات کی، لیکن اس گھر کے بارے میں کوئی بات نہیں کی''۔ اس پر عبدالمطلب نے جواب دیا: ''ان اونٹوں کا مالک میں ہوں، اس لیے میں نے ان کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ اس گھر کا بھی ایک مالک ہے۔ وہ اس کی حفاظت کرے گا''۔

عبدالمطلب کا اپنے اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کرنا مال کے لالچ میں نہیں تھا، بلکہ وہ ان کی گردنوں میں قلادے پہنا کر حرم میں ہانک دینا چاہتا تھے، تاکہ انہیں ضرر پہنچے تو اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھے، جیسا کہ واقدی کی روایت میں اس کی صراحت ہے۔ ۲

ایک روایت میں ہے کہ مکہ کے ایک بزرگ ابومسعود الثقفی نے عبدالمطلب کو ایسا کرنے کا مشورہ دیا تھا ۳ اور چوں کہ ابرہہ کے آدمی عبدالمطلب کے اونٹوں کو ہانک کر لے گئے تھے، اس لیے ان کو واپس لانے کے لیے عبدالمطلب ابرہہ کے پاس گئے تھے۔

ابن اسحاق کی روایت سے معلوم ہوتا ہے اور مستدرک حاکم میں مروی حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت ۴ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عبدالمطلب اور مکہ کے دیگر سربرآوردہ لوگوں نے ابرہہ کے پاس جاکر اسے خانۂ کعبہ کے انہدام سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی اور اس کے عوض اس کے سامنے کچھ مال دینے کی پیش کش کی تھی، لیکن اس نے ان کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔

عربوں کی غیرت وحمیت

معلّم فراہی نے لکھا ہے: ''دنیا کے پردے میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اپنی عبادت گاہ کو خدا کا گھر سمجھتی ہو، پھر اس سے اس بے حمیتی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ بغیر کسی مدافعت کے، اپنا معبد دشمنوں کے حوالے کر کے پہاڑوں میں جا چھپے گی۔ اس طرح کی بے حمیتی کا گمان تو ہم دنیا کی ادنیٰ قوموں کی نسبت بھی نہیں کر سکتے، تو قریش اور بنی اسماعیل کی نسبت کس طرح کر سکتے ہیں، جن کا تمام سرمایۂ فخر و نازش ہمیشہ شہ سواری، شمشیر زنی اور قدر اندازی ہی رہا ہے''۔

عربوں کی غیرت وحمیت برحق ہے، لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ ابرہہ یمن کا بادشاہ تھا۔ اس کے علاوہ عرب کے بعض علاقوں پر بھی قابض تھا۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ نجد اور اطرافِ عراق پر بھی اس کی حکم رانی تھی ۵۔ جاہلی شعراء نے اس کی عظمت کے قصیدے پڑھے ہیں ۶۔ کچھ عرصہ قبل سدّ مارب کی کھدائی میں ایسی تختیاں برآمد ہوئی ہیں جنھیں ابرہہ کے حکم سے لکھا گیا تھا۔ ان میں درج ہے کہ ابرہہ سبا، ریدان، حضرموت، یمنات، عرب النجاد اور عرب السواحل کا بادشاہ تھا''۔ ۷

ابرہہ ایک بڑی فوج لے کر آیا تھا۔ ابن الزبعری کے شعر میں صراحت ہے کہ اس کی تعداد ساٹھ ہزار تھی ۸۔ ان میں سے شہ سواروں کی تعداد کم از کم دس ہزار تھی۔ ساتھ میں تیرہ ہاتھی بھی تھے ۹۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زبردست تیاری کے ساتھ آیا تھا۔

دوسری طرف اہل عرب منتشر تھے۔ ان میں سے بہت سوں نے ابرہہ کی اطاعت قبول کر لی تھی، یہاں تک کہ ان کا ایک گروہ اس کی فوج میں شامل تھا۔ ۱۰ قبیلۂ ثقیف اور دوسرے جن قبیلوں نے راستے میں اس سے جنگ کی تھی وہ شکست کھا چکے تھے اور انھوں نے خود سپردگی اختیار کر لی تھی۔

معلّم فراہی کا خیال ہے کہ ابرہہ کی آمد ایام حج میں ہوئی تھی۔ اگر اسے صحیح

مان لیا جائے تو یہ بات طے ہے کہ اس سال حج کے لیے بہت کم لوگ آئے تھے، کیوں کہ بیش تر عربوں نے ابرہہ کی ماتحتی قبول کر لی تھی اور جو لوگ حج کے لیے آئے ہوں گے وہ اپنی عادت کے مطابق جنگ کی تیاری کے ساتھ نہیں آئے ہوں گے، اس لیے کہ وہ حرام مہینوں میں جنگ کو گناہ کا کام سمجھتے تھے۔

روایات میں ہے کہ ابرہہ نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ جنگ کرنا نہیں چاہتا، صرف خانۂ کعبہ کو ڈھانے کے مقصد سے آیا ہے۔ عربوں کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ضرور اپنے گھر کی حفاظت کرے گا۔ شاید انھوں نے یہ بھی سوچا ہو کہ اگر ابرہہ خانۂ کعبہ کے انہدام میں کام یاب ہو گیا تو کیا ہوا؟ اس کے واپس جانے کے بعد وہ دوبارہ پہلے سے بہتر اس کی تعمیر کر لیں گے۔

مزید برآں، قریش کی زندگی تجارت پر موقوف تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ابرہہ سے جنگ کرنے سے انھیں دو پہلوؤں سے نقصان ہوگا: یا تو وہ مغلوب ہو جائیں گے یا یمن، حبشہ اور شام سے ان کی تجارت کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ شام سے اس لیے کہ اس وقت شام روم کے تابع تھا اور حبشہ اور روم کے درمیان گہرے تعلقات تھے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ اُن حالات میں قریش کا ابرہہ سے جنگ نہ کرنا مستبعد نہیں تھا۔ اس میں ان کے لیے عار کی کوئی بات نہیں تھی اور نہ یہ ان کی غیرت و حمیت کے منافی تھا۔

ابرہہ کی آمد کا زمانہ

لیکن یہ بات صحیح نہیں کہ ابرہہ ایام حج میں مکہ مکرمہ آیا تھا۔ اصحاب سیر نے لکھا ہے کہ اس کی آمد محرم کے نصفِ آخر میں ہوئی تھی ۱۱۔ معلّم فراہی نے ابرہہ کے موسمِ حج میں آنے کی دلیل یہ دی ہے کہ بعض شعراء نے اپنے اشعار میں اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابرہہ کے آدمی جن اونٹوں کو ہنکا لے گئے تھے ان کی گردنوں میں قلادے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قربانی کے اونٹ تھے۔

جن جانوروں کی گردنوں میں قلادے ہوں ان کا قربانی کے لیے متعین ہونا ضروری نہیں۔ اہل عرب جن جانوروں کو چوری اور لوٹ سے بچانا چاہتے تھے ان کی گردنوں میں بھی قلادے ڈال دیتے تھے۔ اس لیے کہ حرم کے احترام کی وجہ سے چور ڈاکو قلادہ والے جانوروں پر ہاتھ ڈالنے سے گریز کرتے تھے۔ سلف کی ایک جماعت سے آیت: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لاَ تُحِلُّوا شَعَآئِرَ اللّٰہِ وَلاَ الشَّھْرَ الْحَرَامَ وَلاَ الْھَدْیَ وَلاَ الْقَلآئِدَ (المائدۃ:۲) کی تفسیر میں یہ قول مروی ہے۔ ۱۲

عبدالمطلب کے، اونٹوں کی گردنوں میں قلادے ڈالنے سے یہ متعین نہیں ہوتا کہ وہ حج کا زمانہ تھا۔ اگر انھوں نے محرم میں قلادے ڈالے ہوں تو ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اگلے حج میں ان کی قربانی کا ارادہ کیا ہو۔

'کید' کے معنیٰ 'مخفی چال' کے نہیں ہیں

معلّم فراہی نے لکھا ہے: ''قرآن مجید میں تصریح ہے کہ اصحابِ فیل نے ایک مخفی چال (کید) چلی تھی، لیکن روایات میں اس کے حملے کے جو وجوہ بیان کیے ہیں، ان میں مخفی چال کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ وہ اس کے برعکس قوت کی نمائش اور عربوں کی تذلیل کی ایک نہایت کھلی ہوئی کارروائی ہے''۔

کید کے لیے چال کا مخفی ہونا ضروری نہیں۔ کید کا مطلب ہے وہ پختہ تدبیر جس میں ندرت ہو۔ اس معنیٰ میں اس کا استعمال قرآن میں متعدد مقامات پر ہوا ہے۔ آل فرعون کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَمَّا جَآءَ ھُم بِالْحَقِّ مِنْ عِندِنَا قَالُوا اقْتُلُوا أَبْنَآءَ الَّذِیْنَ آمَنُوا مَعَہُ وَاسْتَحْیُوا نِسَآءَ ھُمْ وَمَا کَیْدُ الْکٰفِرِیْنَ إِلَّا فِیْ ضَلَالٍ (المؤمن:۲۵)

پھر جب وہ (یعنی موسیٰؑ) ہماری طرف سے حق ان کے سامنے لے آیا تو انھوں نے کہا: ''جو لوگ ایمان لا کر اس کے ساتھ شامل ہوئے ہیں ان سب کے لڑکوں کو قتل کرو اور لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دو''۔ مگر کافروں کی چال اکارت ہی گئی۔

اہلِ ایمان کے لڑکوں کا قتل خفیہ طریقے سے نہیں کرایا گیا تھا، بلکہ علی الاعلان اس پر عمل ہوتا تھا۔ اس میں ندرت یہ تھی کہ اس سے قبل بچوں کا قتل معروف طریقہ نہیں تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں ہے:

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ۔ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ (الصّٰفّٰت: ۹۷۔۹۸)

انھوں نے آپس میں کہا کہ ''اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو''۔ انھوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی، مگر ہم نے انہی کو نیچا دکھا دیا''۔

دہکتی ہوئی آگ میں حضرت ابراہیمؑ کو ڈالنے کا منصوبہ خفیہ نہیں، بلکہ علانیہ تھا۔ اسے کیداس لیے کہا گیا کہ یہ طریقہ اس سے پہلے معروف نہیں تھا۔

ابرہہ کی فوج کشی کو کید سے اس لیے تعبیر کیا گیا، کیوں کہ وہ اہلِ عرب کو مرعوب اور دہشت زدہ کرنے کے لیے ہاتھی لایا تھا، جب کہ اہلِ عرب ہاتھیوں سے جنگ کے طریقے سے نابلد تھے، بلکہ ان میں سے اکثر نے ہاتھی دیکھا تک نہ تھا۔ اورابرہہ نے اس کے لیے ماہ محرم کا انتخاب کیا تھا، جسے اہل عرب حرام مہینوں میں شمار کرتے تھے اوران میں جنگ کرنے کو گناہ سمجھتے تھےاوراس زمانے میں حج کے لیے آنے والے اپنے اپنے ملکوں کو واپس جا چکے تھےاور مکے میں صرف وہیں کے باشندے بچے تھے۔

اشعار کا پس منظر سمجھنے میں لغزش

معلّم فراہی نے لکھا ہے: ''عرب شعراء نے اپنے اشعار میں قبیلۂ ثقیف کی ہجو کی ہے کہ خانۂ کعبہ کی حمایت کے وقت اس نے بزدلی دکھائی اور دشمن سے ساز باز کرلیا۔ چنانچہ ضرار بن خطاب کا شعر ہے:

وفرت ثقیف الی لاتھا بمنقلب الخائب الخاسر

''اورثقیف ایک نامراد بھاگنے والے کی طرح اپنے معبود لات کی طرف بھاگ گئے''

ابرہہ کے ساتھ قبیلۂ ثقیف کی ساز باز پر تمام روایات متفق ہیں اور ابورغال

ثقفی کی قبر، اس گناہ پر کہ اس نے ابرہہ کی فوج کو رستہ بتایا تھا، سنگ بار کی گئی۔ پھر سوچنے کی بات ہے کہ اگر ثقیف کی طرح تمام عرب بھاگ گئے تھے تو آخر قبیلۂ ثقیف ہی کا کیا قصور تھا کہ ان کی ہجو کی گئی، پھر تو ان کا عذر بھی بالکل واضح تھا۔''

یہ شعر ابرہہ کی فوج کشی کے موقع کا نہیں ہے، بلکہ اس کے پندرہ بیس سال کے بعد جنگِ فجار کے موقع کا ہے۔ یہ جنگ قریش ہم راہ کنانہ کے تمام قبائل اور ثقیف ہم راہ قیس عیلان کے تمام قبائل کے درمیان ہوئی تھی۔ اس میں ثقیف نے شکست کھا کر راہِ فرار اختیار کی تھی۔

اس واقعہ کا تذکرہ سیرۃ ابن ہشام میں اختصار سے اور الاغانی میں تفصیل میں ہوا ہے۔ ۱۳؎ دراصل معلّم فراہی کو ابن ہشام کے اندازِ بیان سے غلط فہمی ہوگئی۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ابرہہ جب طائف پہنچا تو قبیلۂ ثقیف نے اس کے پاس حاضر ہوکر عرض کیا: ''اے بادشاہ! ہم آپ کے مطیعِ فرمان ہیں۔ آپ سے ہمارا کوئی اختلاف بھی نہیں ہے۔ آپ جس گھر کو ڈھانے نکلے ہیں وہ ہمارا یہ معبد نہیں ہے''۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ان کی مراد 'لات' کے معبد سے تھی، جس کی وہ انتہائی تعظیم کرتے تھے۔ ابن ہشام نے 'لات' کی تشریح میں ضرار بن خطاب کا مذکورہ شعر درج کر دیا ہے۔ اس سے ان کا مقصود صرف یہ بیان کرنا تھا کہ قبیلۂ ثقیف جس بت کی پرستش کرتے تھے اس کا نام 'لات' تھا، لیکن معلّم فراہی نے یہ سمجھ لیا کہ شعر بھی ابرہہ کی فوج کشی کے موقع کا ہے۔

ابورغال قبیلۂ ثقیف کا سردار نہیں تھا، بلکہ اس کا ایک فرد تھا۔ اس کی قبر کو سنگ بار اس لیے کیا جاتا تھا، کہ اس نے بہ رضا و رغبت ابرہہ کا ساتھ دیا تھا۔ یہ بات بھی ثابت نہیں ہے کہ اس نے ابرہہ کی فوج کی رہ نمائی کی تھی۔ کیوں کہ کہا گیا ہے کہ ابورغال کا زمانہ واقعۂ ابرہہ سے بہت پہلے کا ہے۔ ۱۴؎

آگے معلّم فراہی نے لکھا ہے: ''اہلِ سیر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ابرہہ کے حملے کے پہلے دن سے قبائلِ عرب وقتاً فوقتاً اس کی فوج پر تاخت کرتے رہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عرب عموماً نہ صرف اس کے مخالف تھے، بلکہ اس سے جنگ کرنے کے لیے آمادہ

تھے۔ ابرہہ کے ساتھ ان کی جو جھڑپیں ہورہی تھیں ان کا چرچا بھی ہرجگہ پھیلا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ بعض شعراء نے اس پر فخریے بھی لکھے ہیں۔قدیم اسلامی شاعر ذوالرمہ کہتا ہے:

و أبرهةاصطادت صدور رماحنا جهاراًوعثنون العجاجة أكدر

''اور ہمارے نیزوں نے علانیہ ابرہہ کا شکار کیا اور فضا میں کثیف غبار کا ستون قائم تھا''۔

اس شعر میں صاف تصریح ہے کہ ذوالرمہ کی قوم کے ایک آدمی نے ابرہہ کو نیزہ مارا اور یہ واقعہ جس دن پیش آیا ہے، کثیف غبار آسمان تک بلند تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے ہوا کا طوفان بھیج کران پر سنگ ریزوں کی بارش کی۔''

معلّم فراہی سے مذکورہ بالا شعر کا موقع و محل بیان کرنے میں بھی لغزش ہوئی ہے۔ مکہ پرحملہ آور شاہِ حبشہ کا نام مورخین واصحاب سیر نے ابرہۃ الاشرم ابویکسوم بیان کیا ہے، جب کہ مذکورہ بالاشعر میں جس شخص کا تذکرہ ہے اس کا نام شارحینِ دیوان نے ابرہہ بن الصباح لکھا ہے اور ساتھ ہی اس کا تعارف 'ملک من ملوک حمیر' کے الفاظ سے کرایا ہے۔

لفظ 'ابرہہ' حبشی، بلکہ حمیری زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لفظی معنیٰ 'سفید' کے ہیں۔ یہ نام رکھنے کا قدیم زمانے میں یمن میں چلن تھا، چنانچہ متعدد افراد کا یہ نام ملتا ہے۔مورخین نے شاہانِ حمیر کا تذکرہ اس ترتیب سے کیا ہے: ''ابرہہ بن الصباح نے پینتیس (۳۵) سال حکومت کی، پھرایک اور شخص، جس کے نام میں اختلاف ہے، بادشاہ بنا۔ اس نے سترہ (۱۷) سال حکم رانی کی۔ پھرلخیعہ نے بادشاہت سنبھالی۔ وہ ستائیس (۲۷) سال حکم راں رہا۔ پھر ذونواس نے اڑسٹھ (٦٨) سال حکومت کی۔ اس کے اقتدار کا خاتمہ یمن پر حبشہ کے تسلّط سے ہوا۔اس وقت ارياط اور اس کے بعد ابرہۃ الاشرم ابویکسوم بادشاہ بنا''۔ ۱۵؎

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ابرہۃ بن الصباح، جس کا تذکرہ مذکورہ بالاشعر میں ہے، اس کا زمانہ ابرہۃ الاشرم سے بہت پہلے کا ہے۔قبیلہ نزار اور اہل یمن کے درمیان برابر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ممکن ہے، ان میں سے کسی جنگ میں ابرہہ نامی یمن کا سردار

مارا گیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مارا نہ گیا ہو، بلکہ اسے صرف نیزے کا زخم لگا ہو۔

اہلِ مکہ نے ابرہہ سے جنگ نہیں کی تھی

معلّم فراہی کے نزدیک ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربوں نے اپنے مقدس شہر کی حفاظت کی ۔۔۔ اہلِ مکہ نے پوری قوت سے اصحابِ فیل کا مقابلہ کیا اور ان پر پتھراؤ کیا''۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہلِ مکہ نے ابرہہ سے جنگ نہیں کی تھی۔ اس کے متعدد دلائل ہیں:

۱۔ متعدد روایات میں اس کی صراحت ہے۔ مثلاً ابن اسحاق، واقدی اور ابن الکلبی وغیرہ سے مروی روایت، ابن عباس کی روایت، جسے حاکم نے مستدرک میں بیان کیا ہے اور ذہبی نے اسے صحیح قرار دیا ہے، انہی سے مروی ایک دوسری روایت، جسے ابن مردویہ نے نقل کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں اسے حسن قرار دیا ہے۔

۲۔ جو لوگ عربوں کے احوال سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ اپنی جنگوں کے واقعات اور حالات خوب یاد رکھتے تھے، ان کا اپنی محفلوں میں چرچا کرتے تھے اور انھیں اشعار میں بھی بیان کرتے تھے۔ جنگِ بسوس اور جنگِ داحس وغیرہ کے سلسلے میں انھوں نے گھوڑوں اور شہ سواروں کے نام، قاتلین اور مقتولین کے نام، جنگوں کے احوال اور دیگر جزئیات محفوظ رکھی تھی۔ شعبِ جبلہ کی جنگ رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے انیس (۱۹) سال قبل ہوئی تھی، لیکن الاغانی میں اس کی تفصیلات و جزئیات اس طرح مذکور ہیں کہ معلوم ہوتا ہے، انھیں دورانِ جنگ ہی تحریر کرلیا گیا تھا۔ پھر یہ بات کیوں کر قرینِ عقل ہوسکتی ہے کہ انھوں نے ابرہہ سے جنگ کی ہو اور اسے قتل کردیا ہو، پھر بھی اس کا تذکرہ ان کے بیانات اور اشعار میں نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یہ ایک عظیم الشان واقعہ ہوتا اور اس کا تذکرہ ان کے تاریخی بیانات میں تواتر کے ساتھ ہوتا اور وہ اس پر کثرت سے اشعار کہتے اور اس پر فخر کا اظہار کرتے۔

۳۔ تابعین اور تبع تابعین کی ایک جماعت نے اس واقعہ کو بیان کیا تو انھوں نے صراحت سے کہا کہ اہلِ مکہ نے ابرہہ سے جنگ نہیں کی، بلکہ وہ پہاڑوں میں روپوش ہوگئے۔ مگر کسی نے ان کی تردید نہیں کی۔ اگر یہ واقعہ پیش آیا تھا تو ان کی غیرت وحمیت کیوں برانگیختہ نہیں ہوئی اور انھوں نے واقعہ بیان کرنے والوں سے کیوں نہیں کہا کہ تم

جھوٹ بولتے ہو۔ان لوگوں نے تو جنگ کی تھی اور فلاں فلاں معرکے پیش آئے تھے۔

۴۔ قریش کی تجارت اس واقعہ کے بعد بھی یمن اور حبشہ کی طرف جاری رہی۔ اگر انھوں نے ابرہہ سے جنگ کر کے اسے قتل کر دیا ہوتا تو یمن وحبشہ کی طرف ان کی تجارت کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہوتا۔

۵۔ اس واقعہ کے سلسلے میں جو اشعار منقول ہیں، ان سب میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی گئی ہے کہ اس نے اپنے گھر کی حفاظت کی۔ ان میں ابرہہ سے جنگ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔اس سلسلے میں طالب بن ابی طالب کے اشعار سیرت ابن ہشام میں منقول ہیں اور ابن حبیب کی کتاب المنمق میں بھی کچھ اشعار روایت کیے گئے ہیں۔

کسی روایت میں صراحت نہیں کہ چڑیوں نے لاشیں کھائی تھیں

معلّم فراہی کا دعویٰ ہے کہ چڑیاں کوہ پیکر ہاتھیوں اور مقتولین کی لاشوں کو کھانے کے لیے بھیجی گئی تھیں۔انھوں نے لکھا ہے کہ ''چڑیوں کے بارے میں دو طرح کی روایات ملتی ہیں۔بعض روایات میں ہے کہ چڑیاں شکاری قسم کی اور بڑے قد کی تھیں اور انھوں نے اصحابِ فیل کی لاشوں کو کھایا، جب کہ دوسری روایات میں صراحت ہے کہ چڑیوں نے پتھر برسائے''۔ پھر لکھا ہے کہ ''بعض روایات میں دونوں قسم کی باتیں گڈمڈ ہو گئی ہیں''۔ آخر میں ان کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جن راویوں نے چڑیوں کا لاشوں پر گرنا بیان کیا ہے ان کا بیان عینی شہادت پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور جنھوں نے چڑیوں کا پتھر برسانا ذکر کیا ہے ان کی باتیں قیاسی لگتی ہیں''۔

حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ کسی روایت میں چڑیوں کے لاشوں کو کھانے کا ذکر نہیں ہے۔معلّم فراہی نے اس سلسلے میں تین روایات تفسیرِ ابن جریر طبری سے نقل کی ہیں:

۱۔ ''عکرمہؒ سے روایت ہے کہ یہ چڑیاں سیاہی مائل خاکی رنگ کی تھیں، سمندر کی سمت سے آئی تھیں، ان کے سر شکاری چڑیوں کے سر کی طرح تھے۔'' تفسیر طبری میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: **کانت طیراً خضراً، خرجت من البحر، لها رؤوس کرؤوس السباع، کانت ترمیهم بحجارة معها۔** اللہ تعالیٰ ہمیں اور معلّم فراہی کو

معاف کرے۔ انھوں نے روایت کا آخری جملہ نہیں نقل کیا ہے، جس میں چڑیوں کے پتھر مارنے کی صراحت ہے۔

۲۔ ''حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ان کے چڑیوں کی طرح سونڈ اور کتے کے پنجوں کے مانند چنگل تھے۔'' اس روایت میں ذکر نہیں کہ چڑیوں نے کیا کام انجام دیا؟ لیکن حضرت ابن عباسؓ سے مروی بعض دوسری روایات میں صراحت مل جاتی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں ابن مردویہ کی سند سے ایک روایت نقل کی ہے (اور اسے حسن قرار دیا ہے) جس میں یہ الفاظ ہیں: ... **فدعا الله الطير الأبابيل، فأعطاها حجارة سوداء فلما حاذتهم رمتهم** ۔۱۶؎ (اللہ نے چڑیوں کے جھنڈ بلایے۔ ان کو کالے پتھر دے دیے۔ جب وہ ان کی سیدھ میں آئے تو انھوں نے ان پر پتھر برسائے)۔

۳۔ ''سعید بن جبیرؒ نے فرمایا: یہ چڑیاں سیاہی مائل خاکی رنگ کی تھیں اور زرد گول چونچوں سے ان کا گوشت کھاتی تھیں''۔ تفسیر طبری میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: **طير خضر، لها مناقير صفر، تختلف عليهم**۔ '**اختلف عليه**' کا معنیٰ ہے کسی چیز کا بار بار آنا جانا۔ روایت کے الفاظ '**تختلف عليهم**' کو معلّم فراہی نے **مناقير** (چونچوں) سے متعلق سمجھ لیا، پھر اس سے یہ استنباط کرلیا کہ چونچوں کا ان پر بار بار آنا ان کا گوشت کھانے ہی کے لیے ہوگا، حالاں کہ وہ '**طير خضر**' سے متعلق ہے۔ اس صورت میں اس کا ترجمہ یہ ہوگا: ''ان چڑیوں کے جھنڈ ان پر آتے جاتے تھے''۔

حضرت سعید بن جبیرؒ سے مروی ایک دوسری روایت میں، جسے ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں روایت کیا ہے، چڑیوں کے پتھر پھینکنے کی صراحت ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں: **فأرسل عليهم طير صغار بيض، في أفواهها حجارة أمثال الحمص لاتقع على أحد الاهلك** ۔۱۷؎ (اللہ تعالیٰ نے ان پر چھوٹے سفید رنگ کی چڑیاں بھیجیں۔ ان کے منہ میں چنے کے برابر پتھریاں تھیں۔ جسے وہ پتھریاں لگتیں وہ ہلاک ہوجاتا تھا)۔

کلامِ عرب میں بھی چڑیوں کے پتھر پھینکنے کی صراحت موجود ہے

معلّم فراہی نے ایک فصل قائم کی ہے، جس کا عنوان ہے: ''کلامِ عرب کی

شہادت کہ سنگ باری آسمان اور ہوا سے ہوئی''۔اس کے تحت انھوں نے جو اشعار نقل کیے ہیں ان سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ان میں چڑیوں کے پتھر پھینکنے کا تذکرہ نہیں ہے۔لیکن ان کا استدلال محل نظر ہے۔

انھوں نے جن شعراء کا کلام نقل کیا ہے ان میں طفیل غنوی، ابوامیہ بن ابی الصلت، عبدالمطلب، مغیرہ بن عبداللہ المخزومی اور ایک نامعلوم الاسم شاعر کے اشعار میں نہ ہوا کا ذکر ہے، نہ پرندوں کا۔ پھر ان سے استدلال کیوں کر درست ہوسکتا ہے؟!

جن اشعار سے استدلال کی گنجائش ہے وہ یہ ہیں۔ابوقیس صیفی بن عامر کہتا ہے:

فأرسل من ربهم حاصب یلفّهم مثل لفّ القزم

''پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر 'حاصب' چلی جو خس وخاشاک کی طرح ان کو لپیٹ لیتی تھی''

اسی شاعر کا یہ شعر بھی ہے:

فلما أجازو ابطن نعمان ردّهم جنود الاله بين ساف و حاصب

''جوں ہی وہ بطن نعمان سے آگے بڑھے، خدا کی فوجوں نے 'ساف' اور 'حاصب' کے درمیان نمودار ہوکر ان کو پسپا کردیا''

معلّم فراہی نے لکھا ہے کہ ''عربی میں 'حاصب' اس تند ہوا کو کہتے ہیں جو کنکریاں اور سنگ ریزے لاکر پاٹ دیتی ہے اور 'سافی' اس ہوا کو کہتے ہیں جو گرد و غبار، خس وخاشاک اور درختوں کی خشک پتیاں اڑاتی ہوئی چلتی ہے۔ چڑیوں کے لیے اس لفظ کا استعمال کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔''

اہلِ لغت کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ 'حاصب' حَصَبَ کا اسم فاعل ہے۔ حَصَبَ کا معنیٰ ہے کنکری مارنا۔اس طور پر 'حَاصِب' کے معنیٰ ہوئے 'کنکری مارنے والا'۔ ابوقیس کے مذکورہ بالا دونوں اشعار میں متعین ہوجاتا ہے کہ کنکری مارنے والے پرندے تھے۔اس لیے کہ شاعر نے 'جنود الاله' (اللہ کی فوجیں) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔اگر 'ساف' اور 'حاصب' دونوں سے مراد تیز وتند ہوا لی جائے تو یہ ایک ہی فوج ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ساف سے مراد ہوا اور حاصب سے مراد پرندے ہیں۔

معلّم فراہی نے نفیل بن حبیب خشعمی کا (جو اصحابِ فیل کی ہلاکت کا عینی شاہد تھا) یہ شعر نقل کیا ہے:

حمدت اللہ اذ عاینت طیراً و حصب حجارۃ تلقی علینا

''میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب چڑیوں کو دیکھا اور ہمارے اوپر پتھروں کی بارش ہو رہی تھی''

پھر لکھا ہے کہ ''جو لوگ واقعہ کے عینی شاہد ہیں، چڑیوں اور پتھروں کا ذکر ساتھ ساتھ کرتے ہیں، لیکن یہ کہیں نہیں کہتے کہ یہ پتھر چڑیوں نے پھینکے''۔

مذکورہ بالا شعر میں 'حصب حجارۃ' کے الفاظ تفسیر خازن میں آئے ہیں۔۱۸ سیرت ابن ہشام، تاریخ طبری اور دیگر کتابوں میں 'حصب' کی جگہ 'خِفْتُ' کا لفظ ہے۔ لفظ 'تُلْقِی' کو اگر معروف پڑھا جائے (اس صورت میں دوسرے مصرعے کا ترجمہ ہوگا: میں ان پتھروں سے ڈرا جنھیں وہ چڑیاں ہمارے اوپر گرا رہی تھیں) تو اس میں صراحت ہے کہ پتھر چڑیوں نے پھینکے اور اگر اسے مجہول (تُلْقیٰ) پڑھا جائے (اس صورت میں ترجمہ ہوگا: میں ان پتھروں سے ڈرا جو ہمارے اوپر گرائے جا رہے تھے) تو بھی قرینہ واضح ہے، کیوں کہ شاعر چڑیوں کو دیکھ کر ہی اللہ کا شکر ادا کر رہا ہے۔

ابن حبیب بغدادی کی کتاب المنمّق میں اسی شاعر (نفیل خشعمی) کے کچھ اور اشعار ہیں، جن میں چڑیوں کے پتھر پھینکنے کی صراحت ہے۔ وہ کہتا ہے:

حتی رأینا شعاع الشمس تسترہ طیر کرجل جرادٍ طار منتشرِ

یرمیننا مقبلاتٍ ثم مدبرۃً بحاصبٍ من سواء الأفق کالمطرِ

''یہاں تک کہ ہم نے دیکھا کہ سورج کی شعاعوں کو ٹڈی دل کی طرح آنے
والے پرندوں نے ڈھک دیا جو ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ انھوں نے پورے
افق سے آتے جاتے ہوئے ہمارے اوپر پتھروں کی بارش کر دی''

ان اشعار میں صراحت ہے کہ چڑیاں 'حاصب' پھینک رہی تھیں۔ اس سے متعین ہو جاتا ہے کہ اشعار میں 'حاصب' سے کنکریاں اور سنگریزے اڑانے والی ہوا مراد نہیں لی جا سکتی، بلکہ اس سے مراد وہ کنکریاں ہیں جنھیں چڑیاں پھینک رہی تھی۔

اصحابِ فیل کی لاشیں کیسے ٹھکانے لگیں؟

بعض روایات میں ہے کہ اصحابِ فیل کی ہلاکت کے بعد ایک سیلاب آیا، جو مقتولین کی لاشوں کو بہالے گیا۔ معلّم فراہی انھیں قیاسی قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''جب یہ سوال سامنے آیا کہ ہاتھیوں اور مقتولین کی متعفن لاشیں، جن سے تمام وادیٔ مکہ اَٹ گئی تھی، کس طرح دور کی گئیں؟ تو اس کا جواب یہ دے دیا کہ اللہ تعالیٰ نے سیلاب بھیجا اور وہ سب بہالے گیا، حالاں کہ اس جواب کے بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جو بے پناہ سیلاب ان تمام ہاتھیوں اور اتنی بے شمار لاشوں کو بہالے گیا، آخر اس کی زد سے وادیٔ مکہ کے باشندے کیسے بچ گئے؟ بہر حال یہ ایک رائے اور قیاس ہے، اس کو مشاہدہ اور ذاتی واقفیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس کے بجائے ان کا خیال ہے کہ ''کوہ پیکر ہاتھیوں اور مقتولوں کی لاشوں کو کھانے کے لیے خدا نے سمندر کی جانب سے چڑیوں کے جھنڈ بھیجے۔ اگر یہ لاشیں پڑی رہتیں تو ایک مدت کے لیے مکہ ناقابلِ سکونت ہوجاتا۔ ان چڑیوں نے ابرہہ کے سنگ سار کردہ لشکر کو، جو بالکل بھس کی طرح ہوگیا تھا، صاف کیا۔''

معلّم فراہی نے یہ فرض کرلیا کہ اصحاب فیل کی ہلاکت وادیٔ مکہ میں ہوئی تھی، حالاں کہ روایات اور کلامِ عرب دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدودِ حرم سے باہر ہلاک کیے گئے تھے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے: **ان الفیل لم یدخل الحرم** (ہاتھی حرم میں نہیں داخل ہو پایا تھا)۔ ابن اسحاق کی **السیرۃ**، ابن حبیب کی **المنمق** اور ازرقی کی تاریخ مکہ، اسی طرح امیہ بن ابی الصلت، مغیرہ بن عبداللہ بن مخزوم، عمرو بن الوحید بن کلاب اور نفیل بن حبیب خثعمی کے اشعار میں صراحت ہے کہ اصحابِ فیل مغمّس سے آگے نہیں بڑھ سکے تھے۔ مغمّس طائف کے راستے پر حدودِ حرم سے قریب ایک مقام کا نام ہے۔ اس لیے وادیٔ مکہ کے لاشوں سے اٹ جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پھر ایسا بھی نہیں ہوا کہ ابرہہ کی پوری فوج ایک ہی مقام پر ہلاک ہوگئی ہو۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پتھر جن کو لگتے تھے ان کے جسموں میں گھس جاتے تھے اور جن کو بھی پتھر لگے وہ وہیں ڈھیر ہوکر رہ گئے، لیکن یہ روایات کم زور اور یہ بیانات مشتبہ ہیں۔ معتبر روایات

سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو پتھر لگے وہ چیچک اور شدید خارش میں مبتلا ہو گئے اور سب فوراً ہی ہلاک نہیں ہو گئے، بلکہ نہایت بدحواسی کے عالم میں بھاگے اور راستوں میں مختلف جگہوں پر نہایت بے کسی کی حالت میں انھوں نے جانیں دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مکہ سے قریب ہلاک ہوئے ہوں گے ان کی تعداد زیادہ نہیں ہوگی کہ ان کی لاشوں سے مکہ کی آب و ہوا متغیر ہو جائے۔

اس موقع پر سیلاب آنے کا بیان صرف واقدی کی روایت میں نہیں ہے، بلکہ عکرمہ سے مروی روایت میں بھی اس کی صراحت ہے۔ اور یہ مستبعد بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے، اوسط درجے کا سیلاب آیا ہو جو لاشوں کو بہالے گیا ہو اور اہل مکہ اس کی تباہی سے محفوظ رہے ہوں۔ بالفرض اگر سیلاب نہ آیا ہو تو بعید نہیں کہ اہل مکہ نے وہاں موجود لاشوں کو گڈھے کھود کر ان میں دفن کر دیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس علاقے میں پائے جانے والے شکاری پرندوں اور گِدھوں نے گری پڑی لاشوں کا گوشت کھایا ہو۔

عہدِ جاہلیت اور عہدِ اسلامی میں بڑی بڑی جنگیں ہوئی ہیں، مثلاً کلاب، ذی قار، یرموک اور قادسیہ کی جنگیں۔ ان میں ہزاروں لوگ ہلاک ہوئے، لیکن ان کی وجہ سے ان جنگوں کے علاقے نہ وہاں کے باشندوں کے لیے ناقابلِ سکونت بنے اور نہ اللہ تعالیٰ نے ان لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے عجیب وغریب پرندے بھیجے۔ پھر اگر مان لیں کہ واقعۂ ابرہہ کے موقع پر آنے والے پرندوں نے ہلاک ہونے والوں کا گوشت کھایا تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ انھوں نے ان پر سنگ باری نہیں کی۔ یہ کیوں نہیں مانا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پرندوں کو اصحابِ فیل پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ انھوں نے ان پر سنگ باری کی، جس سے وہ ہلاک ہو گئے۔ پھر انھوں نے ان کا گوشت کھا کر ماحول کو صاف کر دیا۔ قرآن کریم اور روایات میں ان پرندوں کے گوشت کھانے کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ یہ ایک معمول کا کام تھا۔

رمی جمار حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ کی یادگار ہے

معلم فراہی نے لکھا ہے: ''بہت سے قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ منیٰ میں رمیٔ

جمرہ واقعۂ فیل ہی کی یادگار ہے، لیکن ضعیف روایات نے اس حقیقت پر پردہ ڈال رکھا ہے''۔ پھر چند روایات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''صحیح روایات میں سعتِ رمیٔ جمرہ کی اصل کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگر اس کے متعلق کوئی بات صحیح روایات سے ثابت ہوتی تو اس سے بڑھ کر کیا بات ہوسکتی تھی، لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہے، اس کے متعلق کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے اور دین کا معاملہ نہایت اہم ہے۔ اس وجہ سے اس کے معاملے میں ہر قسم کی روایات پر اعتماد کر لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔۔۔ اس وجہ سے ہم نے استنباط کی راہ اختیار کی ہے۔ صحیح اور ثابت چیزوں سے استنباط اس صریح روایت سے زیادہ بہتر ہے جو ثابت نہ ہو۔'' آگے انھوں نے مختلف استنباطات کے ذریعہ رمی جمار کو واقعۂ فیل کی یادگار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معلم فراہی کو معتبر اور قابل قبول روایات سے واقفیت نہیں ہوسکی۔ اس سلسلے کی چند روایات یہ ہیں:

سعید بن منصور نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ سے رمی جمار کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا:

اللہ ربکم تکبرون، وملۃ أبیکم تتبعون، ووجہ الشیطان ترمون ۔ ۱۹؎

اس کے ذریعے تم اللہ اپنے رب کی تکبیر بیان کرتے ہو، اپنے باپ کے طریقے کی پیروی کرتے ہو اور شیطان کے چہرے پر کنکریاں مارتے ہو۔

ابوداؤد طیالسی نے ابوالطفیل سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا:

> ''حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب مناسک دکھائے گئے تو شیطان مسعیٰ کے پاس ظاہر ہوا۔ وہ اس سے آگے بڑھ گئے۔۔۔ پھر جب وہ جمرۃ العقبۃ کے پاس پہنچے تو شیطان پھر نظر آیا۔ انھوں نے اس کو کنکریاں ماریں تو وہ بھاگ گیا۔ پھر وہ جمرۂ وسطیٰ کے پاس پہنچے تو شیطان پھر ظاہر ہوا۔ انھوں نے اسے سات کنکریاں ماریں تو وہ بھاگ گیا۔ پھر وہ جمرۂ قصویٰ پہنچے تو وہاں شیطان پھر دکھائی دیا۔ انھوں نے اسے سات کنکریاں ماریں تو وہ بھاگ گیا۔۔۔''۔ ۲۰؎

اس حدیث کو ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں بیان کیا ہے۔ ۲۱؎

یہ روایت مسند احمد میں بھی متعدد سندوں سے مروی ہے۔ اس کے بعض بیانات میں فرق ہے، لیکن اتنی بات پر اتفاق ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے سامنے شیطان جمرات پر ظاہر ہوا تھا، اس موقع پر انھوں نے اسے کنکریاں ماری تھیں۔ ۲۲؎

حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباسؓ سے اسی مضمون کی روایت نقل کی ہے۔ اس کے آخر میں وہ فرماتے ہیں:

الشیطان ترجمون وملة أبیکم تتبعون۔ ۲۳؎ — تم شیطان کو کنکریاں مارتے ہو اور اپنے باپ کے طریقے کی پیروی کرتے ہو۔

حاکم نے لکھا ہے کہ یہ حدیث شیخین (بخاری و مسلم) کی شرط پر صحیح ہے۔ ذہبی نے اسے صرف مسلم کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے۔ اسے ابن خزیمہ نے بھی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ ۲۴؎

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان حضرت ابراہیمؑ کے سامنے اس وقت ظاہر ہوا تھا جب وہ اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کے لیے لے جا رہے تھے۔ لیکن ان روایات کا پایۂ استناد کم زور ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کے بہت سے طرق و شواہد موجود ہیں۔ اس لیے اس کو نظر انداز کر کے دوٗر دراز کے استنباطات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اشعارِ جاہلیت میں رمیِ جمار کا ذکر موجود ہے

معلم فراہی نے لکھا ہے: ''حج اور اس کے تمام مناسک حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے چلے آ رہے ہیں۔ چنانچہ کلامِ جاہلیت میں اجمالاً و تفصیلاً ان تمام باتوں کا ذکر موجود ہے، لیکن اس میں رمی جمرات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ

نئی چیز ہے اور واقعۂ فیل کے بعد وجود میں آئی ہے۔ چوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ایک بہت بڑے احسان کی یادگار ہے، اس وجہ سے اسلام نے اس کو باقی رکھا اور حج کے مراسم میں شامل کرلیا۔''

یہ بات صحیح نہیں ہے۔نفیل خثعمی، جو اس واقعہ کے عینی شاہدوں میں سے ہے، کہتا ہے:

ردینۃ لو رأیت ولن تریہ لدی جنب المحصب ما رأینا

''ردینہ! کاش تو دیکھ لیتی اور اب ہرگز نہیں دیکھ سکتی، جو محصّب کے پہلو میں ہم نے دیکھا۔''

اصمعی کا قول ہے کہ ''محصّب وہ جگہ ہے جہاں کنکریاں ماری جاتی ہے''۔ ۲۵ جب واقعۂ ابرہہ کا عینی شاہد اس جگہ کو 'محصّب' کہہ رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا یہ نام یہ واقعہ پیش آنے کے بعد نہیں رکھا گیا، بلکہ پہلے سے معروف تھا۔

معلم فراہی کی اختیار کردہ تاویل کے ممکنہ وجوہ

معلم فراہی کی اختیار کردہ تاویل کا خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ مکہ نے اصحابِ فیل سے جنگ کی اور یہ کہ اصحاب فیل پر چڑیوں نے پتھریاں نہیں برسائیں۔ انھوں نے یہ تاویل کیوں اختیار کی؟ اس کی ممکنہ وجوہ درج ذیل ہوسکتی ہیں:

۱۔ اہلِ عرب کی غیرت وحمیت معروف ہے۔ اس بنا پر انھوں نے اسے بعید خیال کیا کہ وہ اللہ کے گھر کی حفاظت کے لیے کمر بستہ نہ ہوں اور بزدلی کا مظاہرہ کریں۔ ایسے موقع پر کم زوری دکھانا ایک عیب تصور کیا جاتا ہے۔ اس عیب کی طرف نسبت قریش کی طرف ہوتو اسے بعض کفار وملحدین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی عیب جوئی کا بہانہ بناسکتے ہیں، اس لیے کہ آپ اس کے ایک فرد تھے۔

اس تاویل کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ گزشتہ صفحات میں واضح کیا جاچکا ہے کہ اہلِ مکہ ابرہہ کی فوج کا مقابلہ نہ کرنے میں معذور تھے۔ یہ ان کی بزدلی کا مظہر ہے نہ اس میں ان کے لیے عیب کا پہلو نکلتا ہے۔

۲۔ معلم فراہی کے نزدیک ''قدرت کے تمام کارخانۂ خلق وایجاد میں پردہ داری

کی جو شان ہے، وہ معجزات کے ظہور میں بھی قائم رہتی ہے۔ اس کی حکمت نے عالم غیب اور عالم شہود کے مابین اسباب کے پردے ڈال رکھے ہیں اور اس کی مرضی یہ ہے کہ ہم اس کے جمال و جلال کا مشاہدہ ان پردوں کی آڑ ہی سے کریں، تاکہ امتحان و آزمائش اور آزادیٔ رائے کے ساتھ تربیتِ اخلاق کا جو مقصد قدرت نے پیش نظر رکھا ہے، وہ پورا ہو'۔ اسی وجہ سے انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ اہل مکہ نے سنگ باری کی اور اس کے پردے میں اللہ تعالیٰ نے تیز آندھی کے ذریعے سنگ باری کر کے ان کو تباہ و برباد کر دیا۔

صحیح بات یہ ہے کہ تمام خوارق میں پردہ داری کی شان نہیں ہوتی، بلکہ یہ چیز صرف ان خوارق میں پائی جاتی ہے جو انبیاء کے ذریعے ان کی قوموں پر حجت قائم کرنے کے لیے دکھائے جاتے ہیں۔ لیکن جو خوارق عذاب کے لیے رؤنما ہوں ان میں پردہ داری کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ وہ علانیہ سامنے آتے ہیں۔ واقعۂ فیل میں رمی کسی پر حجت قائم کرنے کے لیے نہیں کی گئی تھی، بلکہ وہ عذاب کی نشانی تھی، اس لیے اس کا ظہور بھی علانیہ ہوا۔

۳۔ بعض انگریز فلاسفہ اور دانش ور اور ان کے خوشہ چیں ملحدین خوراق کا انکار کرتے اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اگر قرآن میں ان کا ذکر مان لیا جائے تو وہ قرآن کی تکذیب کرنے لگیں گے۔ اس لیے قرآن کے معاملے میں شدید غیرت رکھنے والے اور اسے مطاعن سے پاک رکھنے کی کوشش کرنے والے معجزات پر مشتمل قرآنی نصوص کی ایسی تاویل کرنے لگتے ہیں کہ کوئی ان پر طعن نہ کر سکے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ معلم فراہی نے اپنی تاویل اسے ضعیف جاننے کے باوجود اختیار کی، لیکن یہ بعید نہیں ہے کہ قرآن کے معاملے میں شدّتِ غیرت اور اسے مطاعن سے پاک رکھنے کی شدید خواہش کی وجہ سے ان کا میلان اس تاویل کی جانب ہو گیا ہو۔

حواشی و مراجع

۱۔ ملاحظہ کیجیے طبقات ابن سعد، دار صادر بیروت: ۱/ ۹۱، تاریخ ابن جریر، دار المعارف: ۲/ ۱۳۱

۲۔ طبقات ابن سعد: ۱/ ۹۲

۳۔ ملاحظہ کیجیے تفسیر البغوی: ۴/ ۶۸۸

۴؎ مستدرک حاکم: ۲/ ۵۳۵، حدیث نمبر ۳۹۷۴
۵؎ الاغانی، مطبوعہ الثقافۃ، ۱۸/ ۳۰۳، الشعر والشعرائ، طبع شاکر، ص ۳۷۹
۶؎ ملاحظہ کیجیے کتاب المعمرین، ص ۲۸-۲۹، معجم الشعراء للمرزبانی، ص ۳۰۰، شواہد المغنی للسیوطی، ص ۶۶، البیان والتبیین للجاحظ، طبع ہارون: ۱/ ۲۶۷، دیوان لبید، ص ۱۰۸
۷؎ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، (عربی ترجمہ)، ۱/ ۶۱
۸؎ سیرۃ ابن ہشام، طبع السقا، ۱/ ۵۸
۹؎ طبقات ابن سعد، ۱/ ۹۲
۱۰؎ ملاحظہ کیجیے امیہ بن ابی الصلت یا اس کے باپ کا شعر، سیرۃ ابن ہشام: ۱/ ۶۰
۱۱؎ السہیلی، الروض الانف: ۱/ ۲۷۰
۱۲؎ تفسیر طبری، ۹/ ۴۶۸
۱۳؎ سیرۃ ابن ہشام: ۱/ ۱۸۴-۱۸۷، الاغانی، ۲۲/ ۷۵
۱۴؎ ملاحظہ کیجیے معجم البلدان
۱۵؎ ملاحظہ کیجیے مروج الذہب: ۱/ ۵۷۵-۵۷۶، ۵۸۷، التیجان لابن ہشام، ص ۳۰۰، صبح الاعشی، ۵/ ۲۴، المعارف لابن قتیبۃ، ص ۲۱۳ و مابعد
۱۶؎ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، کتاب الدیات، باب من قتل لہ قتیل فہو بخیر النظرین۔
۱۷؎ مصنف ابن ابی شیبہ
۱۸؎ تفسیر خازن: ۴/ ۲۹۳
۱۹؎ حاشیہ ایضاح المناسک لابن حجر، ص ۱۷۷
۲۰؎ مسند طیالسی، ص ۳۵۱، حدیث نمبر ۲۶۹۷
۲۱؎ فتح الباری، کتاب الحج، باب ماجاء فی السعی بین الصفا والمروۃ، ۳/ ۵۰۳
۲۲؎ مسند احمد، ۱/ ۳۰۶، حدیث نمبر ۲۷۹۴
۲۳؎ مستدرک حاکم، ۱/ ۴۶۶، حدیث نمبر ۱۷۱۳
۲۴؎ صحیح ابن خزیمہ، حدیث نمبر ۲۹۶۷۔ یہ المعجم الکبیر میں بھی مروی ہے۔ ملاحظہ کیجیے حدیث نمبر ۱۲۲۹۱-۱۲۲۹۳
۲۵؎ لسان العرب، مادہ ح ص ب

☆☆☆

تعارف وتبصرہ

مالیاتی نظم کا قیام ۔تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں ڈاکٹر حافظ محمود اختر

ناشر: مکتبہ جدید پبلشرز، ایمپرس روڈ، لاہور، ۲۰۱۳ صفحات: ۲۷۶، قیمت: ۔/۴۰۰ روپے (پاکستانی)

اسلام میں مال و دولت کے حصول کے جائز ذرائع اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے اور فضول خرچی کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ یہ تعلیمات جہاں افراد کے لیے ہیں، وہیں ریاست کو بھی ان کا پابند کیا گیا ہے۔صدرِاول میں ان تعلیمات پر عمل کیا گیا تو اسلامی ریاست کا رقبہ لاکھوں مربع میل تک وسیع ہوجانے کے باوجود عوام کو اتنی خوش حالی اور آسودگی حاصل ہوئی کہ زکوٰۃ وصول کرنے والے خال خال نظر آتے تھے، لیکن بعد میں جب مسلم حکومتوں نے انھیں نظر انداز کر دیا، دولت حاصل کرنے کے لیے عوام پر ظالمانہ ٹیکس عائد کیے جانے لگے، رشوت خوری اور ظلم وستم کا بازار گرم ہوا، پھر بے دردی سے دولت خرچ کی جانے لگی اور مالی بدعنوانیاں کی جانے لگیں تو وہ حکومتیں مالی بحران کا شکار ہونے لگیں اور سماج انتشار اور انارکی کی نذر ہوگیا۔ زیرنظر کتاب میں اس موضوع پر علمی وتحقیقی انداز میں دلائل اور مثالوں کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں متعدد فصلیں ہیں۔ باب اوّل میں مالیاتی نظم (یعنی اکتسابِ دولت، صرفِ دولت اور ٹیکسوں کی وصولی کے ذرائع) کا مفہوم واضح کرتے ہوئے اس کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس کا قیام واستحکام اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب بیت المال کو امانت سمجھا جائے، حکم راں سادہ زندگی گزاریں اور عیش وعشرت کے مظاہر سے اجتناب کریں۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو معاشی بدنظمی پیدا ہوگی اور مملکت کے استحکام پر اس کے برے اثرات پڑیں گے۔ اگلے دو ابواب میں عہد نبوی اور خلافتِ راشدہ میں محاصل کی وصولی اور تقسیمِ دولت کے اصول اور طریقوں سے بحث کی گئی ہے۔ آخری باب میں حکومت کے ذریعے زکوٰۃ کی تقسیم کے نظام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

فاضل مصنف اپنی اس فکر کو نمایاں کرنے میں کام یاب ہیں کہ مالیاتی نظم کا استحکام تعلیماتِ نبوی پر عمل کرنے میں مضمر ہے اور ان سے اعراض کرنے سے مالیاتی بدنظمی پیدا ہونا لازمی ہے۔ کتاب میں پاکستانی پس منظر بہت نمایاں ہے۔ پوری کتاب میں جابہ جا اور خاص طور پر ہر باب کے آخر میں پاکستان کی ابتر صورت حال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعض عربی مراجع کے اردو تراجم سے

کام چلایا گیا ہے، جب کہ اصل مراجع سے رجوع کرنا اور ان کا حوالہ دینا بہتر تھا۔ کمپوزنگ کی غلطیوں کی کثرت کھٹکتی ہے۔ آخر میں کتابیات کی کمی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

عرفانِ شبلی　　کلیم صفات اصلاحی

ناشر: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، سنہ اشاعت: ۲۰۱۴ئ، صفحات: ۲۷۲، قیمت -/۲۵۰ روپے

علامہ شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ئ) کی وفات کو سو سال گزرنے پر ہند و بیرون ہند میں بہت سے سمینار، سمپوزیم، مذاکرے اور علمی مجلسیں منعقد کی گئی ہیں اور ان میں ان کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور علمی مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح اس مناسبت سے ان کی شخصیت اور خدمات کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک زیر تبصرہ کتاب بھی ہے۔

مولانا کلیم صفات اصلاحی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے رفیق ہیں۔ اس کے ترجمان ماہ نامہ معارف میں برابر لکھتے رہتے ہیں اور دیگر رسائل میں بھی ان کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل تاریخِ چیچنیا پر ان کی کتاب علمی حلقوں میں قبولیت حاصل کر چکی ہے۔ علامہ شبلی کی علمی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر ان کے جو مقالات گزشتہ عرصہ میں بعض سمیناروں میں پیش کیے گئے تھے یا علمی مجلّات میں شائع ہوئے تھے، ان کا مجموعہ زیر نظر کتاب کی صورت میں طبع کیا گیا ہے۔

یہ کتاب آٹھ (۸) مقالات پر مشتمل ہے۔ پہلے مقالے میں حیاتِ شبلی کے زبانی اور مراسلاتی مآخذ سے بحث کی گئی ہے۔ اس لحاظ اس کا مواد مولانا سید سلیمان ندویؒ کی حیاتِ شبلی پر اضافہ ہے۔ دوسرے مقالے میں علامہ کی تحریروں کی روشنی میں ان کے قرآنی افکار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے مقالے میں سیرۃ النبی شبلی میں وارد روایاتِ طبری کی استنادی حیثیت کا تعین کیا گیا ہے۔ چوتھے مقالے میں علامہ کی فقہی آراء کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ پانچویں مقالے میں خواتین سے متعلق ان کے افکار پیش کیے گئے ہیں۔ چھٹے مقالے میں سائنسی موضوعات پر ان کی تحریروں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ساتویں مقالے میں ان کی کتاب 'سوانح مولانا رومؒ' کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ آٹھویں مقالے میں یہ بحث کی گئی ہے کہ کس طرح علامہ نے ندوۃ العلماء کے نصاب میں 'الدروس الأولیۃ' (جو عربی زبان میں جدید سائنس کی کتاب تھی) کو شامل کروایا اور اس کی تدریس کے لیے مولانا فراہی کو آمادہ کیا۔ علامہ شبلی کی سوانح اور خدمات پر یوں تو بہت کتابیں شائع ہوئی ہیں، لیکن بہ قول مصنف "انھوں نے ان پہلوؤں کو موضوعِ بحث و تحقیق بنایا ہے، جن سے محققینِ شبلیات نے عام

طور پر صرف نظر کیا ہے، یا اگر ان کی جانب توجہ بھی دی ہے تو محض ضمنی اور سرسری طور پر دی ہے" (ص ۱۷)

اس کتاب پر پیش لفظ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی نے لکھا ہے۔ انھوں نے بجا طور پر مصنف کی کاوش کی تحسین کی ہے۔ امید ہے، یہ کتاب علمی حلقوں میں مقبول ہوگی اور شبلی شناسی میں معاون ثابت ہوگی۔ (م۔ر)

شعاعِ نوا (مجموعۂ نعت) رئیس احمد نعمانی

ناشر: گوشۂ مطالعاتِ فارسی، علی گڑھ، صفحات: ۱۹۰، قیمت -/۱۵۰ روپے

نعت ایک مشکل اور نازک صنف ہے۔ یوں تو نعت گو شعراء کی کمی نہیں، مگر ایسے نعت گو بہت کم ہیں جو فکر کی پاکیزگی اور قلب کی طہارت کے ساتھ خالص اور صاف ستھری نعت کہنے کے اہل ہیں۔ ڈاکٹر رئیس نعمانی صالح فکر کے مشہور نعت گو شاعر ہیں۔ ان کے کئی مجموعے شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔ اب ایک نیا مجموعۂ نعت 'شعاعِ نوا' کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ اس میں طریقۂ اظہار محتاط اور جذبۂ محبت مستحکم ہے اور حبِّ رسول پر مبنی پاکیزہ خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کسی کا قدرتِ باری میں اشتراک نہیں نبی، شہید ہو یا آدمی ولی ہوجائے
کسی ولی میں، نبی میں نہیں کوئی قدرت جو کچھ جسے ملا اللہ کی عطا سے ملا
تقدیر سے ہوتی ہے طیبہ کی زیارت بھی ناداں ہیں جو کہتے ہیں سرکار بلائیں گے

اس مجموعے میں نعت گوئی کی پاکیزہ روایت کو برقرار رکھا گیا ہے۔ عقیدت اور جذبات سے مغلوب ہوکر شعر کہنے اور محبت کا اظہار کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نعمانی کا خیال ہے کہ ''عقائد و نظریات کی ذرا سی بھی نادرستی اور آداب میں ادنیٰ سی بھی کوتاہی نعت گو کے 'نغمۂ انبساط' کو 'نالۂ حسرت' میں تبدیل کرسکتی ہے''۔ انھوں نے بڑی جامع بات کہی ہے کہ شاعری میں علی الترتیب تین عناصر ہوتے ہیں: تخیل، نظریہ، فن۔ مگر نعتیہ شاعری میں یہ ترتیب اس طرح قائم رکھنا واجب ہے: نظریہ، فن، تخیل۔ اس ترتیب کو بدل کر یا ختم کرکے جو حضرات شعر کہتے ہیں، ان پر قرآن کی یہ آیت صادق آتی ہے: اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ (الشعرائ: ۲۲۵) ''وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں''۔

اس مجموعے میں نعتوں کے علاوہ قصیدے اور سلام بھی شامل ہیں۔ امید ہے، اہلِ فن کے درمیان اسے مقبولیت حاصل ہوگی۔ (محمد رضوان خاں)

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۵۴)

☆ صدر ادارہ وامیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری نے 'حقوقِ نسواں' کے موضوع پر جو علمی کام کیا ہے، اسے عالمی سطح پر اعتبار واستناد حاصل ہوا ہے۔ ان کی ایک کتاب 'عورت اور اسلام' کے نام سے ہے، جس کے اب تک دس (۱۰) ایڈیشن طبع ہو چکے تھے۔ حال میں اس اس کا نیا ایڈیشن مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ صفحات: ۱۳۶، قیمت -/۶۰۔ اس کتاب کا گجراتی ترجمہ اسلامی ساہتیہ پرکاشن گجرات نے شائع کیا ہے۔ صفحات: ۱۲۰، قیمت -/۷۰ روپے۔

☆ 'غیر اسلامی ریاست اور مسلمان' مولانا کی مقبول کتابوں میں ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کسی غیر اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے ایک مسلمان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ حال میں اس کتاب کا تامل ترجمہ (صفحات: ۱۲۸، قیمت -/۶۰ روپے) بڑے اہتمام سے اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ چنّئی سے شائع ہوا ہے۔ اس کا کنڑ ترجمہ بھی منگلور سے شائع ہوا ہے۔ (صفحات: ۴۰، قیمت -/۲۵ روپے)

☆ ۲۶/اکتوبر ۲۰۱۴ء کو ادارہ کے کانفرنس ہال میں معروف محقق اور دانش ور ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی کا توسیعی خطبہ 'مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا طرز استدلال' کے عنوان سے ہوا۔ اجلاس کی صدارت ڈاکٹر کنور محمد یوسف امین، پروفیسر شعبۂ علم الادویہ، اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے فرمائی۔ یونی ورسٹی کے اساتذہ، طلبہ اور دیگر اصحاب علم نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

☆ جنوبی ہند کی مشہور درس گاہ جامعہ دارالسلام عمر آباد کے منتہی درجات کے چالیس طلبہ نے اپنے دو اساتذہ کے ساتھ شمالی ہند کے مشہور دینی مدارس، علمی وتحقیقی اداروں اور تاریخی مقامات کا دورہ کیا۔ یہ وفد ۱۹/دسمبر ۲۰۱۴ء کو علی گڑھ آیا۔ اس نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے مختلف شعبہ جات کے علاوہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی بھی زیارت کی۔ اس موقع پر ایک علمی مجلس کا انعقاد کیا گیا، جس میں مسلم یونی ورسٹی کے بعض اساتذہ نے انھیں آئندہ کی تعلیمی زندگی کے لیے مشورے دیے۔ سکریٹری ادارہ نے ادارہ کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد یہ وفد دہلی گیا، جہاں اس نے مرکز جماعت اسلامی ہند میں چند دن قیام کیا اور اس کے اداروں سے واقفیت حاصل کی۔

☆ ادارہ کے منصوبہ کے تحت اس کے اراکین مولانا ضمیر الحسن فلاحی اور مولانا کمال اختر قاسمی نے اپنا کام مکمل کرلیا ہے۔ توقع ہے، جلد کتابی صورت میں منظر عام پر آئے گا۔

ISSN:2321-8339

Organ of Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami

Quarterly

TAHQEEQAT-E-ISLAMI
ALIGARH

Vol. 34 No. 1

January - March 2015

Editor
Syed Jalaluddin Umari

Asstt. Editor
Mohammad Raziul Islam Nadvi

Nabi Nagar (Jamalpur), P.O. Box: 93
ALIGARH - 202 002 (INDIA)
www.tahqeeqat.net Email: tahqeeqat@gmail.com

CONTENTS

1. **The Prophet's Seerah and Its Sources**
   Syed Jalaluddin Umari 5

2. **Role of the Great Negus of Abyssinia in the Protection and Spread of Islam** 13
   Prof. Dr. M. Yasin Mazhar Siddiqui

3. **The Citizenship Issue: Islamic Perspective** 31
   Maulana Akhtar Imam Adil Qasmi

4. **The Use of Government Posts and Sources In the light of Prophetic Teachings** 63
   Mr. Abdul Muhaimin

5. **Ibn Syed Al-Nas and His Seerah Book** 79
   Hafiza Sabiha Munir

6. **Maulana Farahi's Commentary of Surah Al-Feel: A Critical Appraisal** 95
   Shaikh Abdur Rahman al-Mu'allimi al-Yemani
   Tr.: *Dr. Muhammad Raziul Islam Nadvi*

7. **Book Reviews** 117

8. **Activities of Idara-e- Tahqee-o-Tasneef-e-Islami** 120

Abstract of the Articles

The Prophet's Seerah and Its Sources

Syed Jalaluddin Umari
President Idara Tahqeeq-o- Tasneef-e- Islami
& Amir Jamaat-e-Islami Hind

Maulana Syed Jalaluddin Umari has been writing on the subjects related to Seerah. His articles find place in the quarterly journal *Tahqeeqat-e-Islami* and monthly *Zindgi-e-Nau*. Besides, some of his writings have been published in the form of books and booklets. One of his voluminous collections of works entitled *Awraaq-e-Seerat* is soon to be published by Markazi Maktaba Islami Publishers, New Delhi. The present article is in fact the Foreword the Maulana has written for that collection of works. He has introduced the contents of the book therein. Important incidents of Makkan and Madinan periods, and the teachings and the message as well as the academic contributions of the Messenger (peace and blessings of Allah be to him) have been specifically discussed in these works.

Towards the end of this Foreword it has been mentioned that the sources of the Prophet's Seerah are the Qur'an and Hadith and Seerah literatures. However, there is need of precaution while benefiting from the Seerah literature, for it lacks in academic health and dependable and undependable both kinds of traditions have been collected therein.

Role of the Great Negus of Abyssinia in the Protection and Spread of Islam

Prof. Dr. M. Yasin Mazhar Siddiqui
Ex. Chairman, Dept. of Islamic Studies,
Aligarh Muslim University, ALIGARH
Mnz_Camp@yahoo.in

Almost all the biographers of the Holy Prophet Muhammad (peace and blessings of Allah be to him), classical and modern alike, very judiciously and scholarly discussed the exemplary role of the great Negus of Abyssinia in providing shelter for the Muslim immigrants of Makkah in 615-16 C.E. and protecting them in his country from all onslaughts of tirade, physical persecution, religious criticism and ethnic prejudices. He had also been praised for his character, vision, mental prowess, religious tolerance, justice and political sagacity and liberal rather generous treatment of Arabian Immigrant Community who were forced to leave their homeland by their own kith and kin simply because they wanted to practise their religion as they liked.

In this article some new dimensions of the role and character of the great Negus have been highlighted: First, being a true follower of the real Christianity and visionary scholar and intellectual, he openly and courageously declared to the great unhappiness and disgust of his religious and political courtiers that the religion brought by the Holy Prophet Muhammad (peace and blessings of Allah be to him) is not only similar to the religion of Jesus Christ but also final culmination of the true religion of Islam; admitting that the Holy Qur'?n and Real Injeel have emanated from one mishkat, the only source of divine knowledge and guidance.

Secondly, he approved of the Religion of Muhammad Rasul Allah and followed it, although his conversion has been doubted or misinterpreted by Muslim and Western scholars; his conversion to Islam is sufficiently illustrated by the facts and traditions.

Thirdly, the great Negus not only allowed Muslims of Arabia to practise their religion freely but also punished those who jeered, mocked, criticised or persecuted the Muslims in any way, applying law and government machinery for creating and furthering the religious and ethnic tolerance and harmony.

Fourthly, he also allowed the Muslim immigrants to preach their religion peacefully but also protected the neo-converts of Abyssinian origin and also allowed Abyssinian deputations to visit the Holy Prophet at Makkah and Madinah from 616-629; some of the visitors accepted Islam at the hands of the Prophet.

Lastly, the great Negus exploited his commercial and political contacts with a number of great leaders of Quraysh who visited him to seek their Muslim brethren's exile from his country by convincing them of the genuineness of Islam and its Last Prophet and at times exhorted them to follow him sincerely as he himself had done so. One of the greatest statesmen and political and military leader of Quraysh Hazrat Amr b. al -As al-Sahmi (RA) was so impressed by his arguments and preaching that he accepted Islam at the hands of the Great Negus and immediately after he rushed to Madinah to surrender himself to the Holy Prophet. This was not the only one example of Negus' preaching. In fact, the Negus of Abyssinia was an epitome of truth and became as a Role-Model for Christian leaders and states of modern times.

The Citizenship Issue: Islamic Perspective

Maulana Akhtar Imam Adil Qasmi
Rector Jamia Rabbani, Manorwa Sharif, Samastipur, Bihar
aiadil.akhtar@gmail.com

The citizenship issue is from among the modern issues of the present era. In the modern parlance, citizenship is the particular source of contact between an individual and the

government, on the basis of which he enjoys some rights and has to fulfil some responsibilities. Some issues related to it need to be discussed in Islamic perspective. For example, if a foreign Muslim asks a Muslim state for citizenship, is the state bound to grant him citizenship? In the light of Islamic teachings, the answer is in the affirmative. Likewise, if the Muslims living in a country face persecution and urge a Muslim state to grant them political refuge, the state ought to grant acceptance to the plea. However, if their stay in the Muslim state is temporary, they should be granted refugee status instead of permanent citizenship. Can Muslims get the citizenship of a Non-Muslim state? As for its unlawfulness and lawfulness, there are two groups of Ulema. In the prevailing circumstances, the viewpoint of the Ulema who stand for its lawfulness seems to be proper. Can Non-Muslims be granted citizenship in a Muslim state? The answer is in the affirmative. However, in this regard Arabia is an exception, for providing permanent citizenship for Non-Muslims is prohibited there. This article dwells deep upon these issues in the light of valid arguments.

The Use of Government Posts and Sources
In the light of Prophetic Teachings

Mr. Abdul Muhaimin
Chairman Dept. of Islamic and Religious & Studies,
University of Haripur (Pakistan)
muhaimin74@gmail.com

The Holy Messenger (peace and blessings of Allah be to him) took many measures to make the society exemplary. One of them was creation of posts and deployment of executives thereon. Some of these posts were already there in Makkah. The Messenger (peace and blessings of Allah be to him) retained them and created some new ones. While assigning duties, he kept in view eligibility of candidates. He used to issue instructions to

government employees from time to time. Some of his instructions are of general nature, wherein lies guidance for government employees besides other people. While on certain occasions, he directly addressed government employees to guide them. For example, he has enjoined to follow brotherhood, compassion, halal (permissible) income, humility, good manners and keeping from bribery. He tried to create a sense of responsibility in the employees and also subjected them to accountability from time to time.

Ibn Syed Al-Nas and His Seerah Book

Hafiza Sabiha Munir
Scholar, Dept. of Islamic Studies,
University of the Punjab, Lahore, Pakistan
hafizasabihamunir@gmail.com

Seerah writing is one of the most sought-after topics in Islamic studies, which started in the 1st century of Hijrah. Then, in the last fourteen centuries, its evolutionary stages came forth in the form of thousands of books and manuscripts pertaining to different and diverse topics. Imam Ibn Syed Al-Nas holds a great standing among the classic biographers. His book Uyun al-Athar is regarded as an important addition to the annals of Seerah writing. It is distinguished because of its prominent features like mentioning the date of historical incidents, describing the various opinions about Seerah incidents and then, indicating the authentic one. This paper gives an overview of the life of Ibn Syed Al-Nas, his teachers and academic contributions, opinions of his contemporaries on him, his position in the field of Seerah writing, and his book Uyun al-Athar.

Maulana Farahi's Commentary of Surah Al-Feel : A Critical Appraisal

Shaikh Abdur Rahman al-Mu'allimi al-Yemani
Tr.: Dr. Muhammad Raziul Islam Nadvi
Secretary, Tasneefi Academy, JIH, New Delhi
mrnadvi@yahoo.com

In his commentary of Surah al-Feel, Maulana Hamiduddin Farahi (1863-1930 C.E.) presented his point of view that the Makkans had countered with valour the Yemeni king Abraha and rained stones on his army when the latter had come to Makkah with a view to demolish Ka'aba; and Allah the Exalted too inflicted them with a great tempest whereby the entire army was annihilated. Later on, Allah the Exalted sent birds to feed upon their corpses. This point of view ran contrary to the majority of Ummah. This is why many Ulama have discarded it. Discarding this point of view, a book by a Yemani scholar Shaikh Abdur Rahman ibn Yahya al-Mu'allimi (1895-1966), who rendered his services to *Dairatul Ma'arif al-Osmania* Hyderabad, has been published recently. In this book he has proved that the Makkans had not fought with Abraha, and the birds were sent to rain down pebbles thereon, not to feed upon their corpses. In this regard, he has argued on the bases of both traditions and the Arab literature. This article presents an abridged translation of this book.

BOOK REVIEWS

1. *Maliyaati Nizam ka Qiyam* (Establishment of Monetary System) Hafiz Mahmood Akhtar; 2013; Pages: 276; Price Pk 400/-
   Reviewed by Mohammad Raziul Islam Nadvi

2. *Irfan-e Shibli* (Essays about Academic Contributions of Allama Shibli) Maulana Kaleem Sifat Islahi ; 2014; Pages: 272; Price IR 250/-
   Reviewed by Mohammad Raziul Islam Nadvi

3. *Shua-e- Nawa* (Compilation of Nat) Dr. Rais Nomani; 2013; pages 192 , Price IRs.150/-
   Reviewed by Mohammad Rizwan Khan

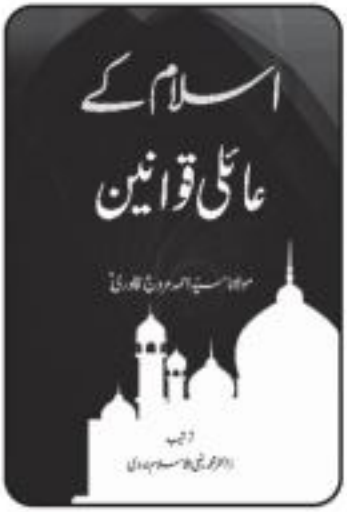

اسلام کے عائلی قوانین

مولانا سید احمد عروج قادریؒ

ترتیب

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

مسلم پرسنل لا کی مخالفت میں عرصہ سے آوازیں اٹھائی جارہی ہیں اور اسلام کے عائلی قوانین کو ہدف تنقید بنایا جارہا ہے۔ اس کتاب میں مسلم پرسنل لا کے تعارف کے ساتھ اس کی مخالفت کرنے والوں کے افکار وخیالات کا تعاقب کیا گیا ہے اور اسلام کے عائلی قوانین: نکاح، مہر، تعدد ازواج، طلاق، نفقہ، مطلقہ اور وراثت وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، ان پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے اور ان قوانین کی معقولیت ثابت کی گئی ہے۔

اس کتاب سے ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کی جدوجہد کے مراحل پر روشنی پڑتی ہے اور اسلام کے عائلی قوانین کی بھی بہ خوبی وضاحت ہوتی ہے۔

مسلم پرسنل لا کے مسائل کو سمجھنے کے لیے ایک قیمتی دستاویز۔

● سائز: $\frac{23 \times 36}{16}$ ● صفحات: 280 ● قیمت: 140.00

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵

D-307,Dawat Nagar,Abul Fazl Enclave,Jamia Nagar,New Delhi-110025
Phone:26981652,26984347 Fax: 26987858
E-mail: mmipublishers@gmail.com • **Website:** www.mmipublishers.net

R.No. 38933/81

Quarterly
Tahqeeqat-e-Islami
Aligarh

January...........2015 — March...........2015

Mob. 09897655171
Phone: 0571-2902034

مولانا سید جلال الدین عمری کی مطبوعات

شمار	نام کتاب	قیمت	شمار	نام کتاب	قیمت
۱	تجلیات قرآن	۳۰۰/-	۲۲	خطبات پاکستان	۱۰۰/-
۲	اسلام - انسانی حقوق کا پاسبان	۵۵/-	۲۳	عصر حاضر میں اسلام کے علمی تقاضے	۵۲/-
۳	غیر اسلامی ریاست اور مسلمان	۲۵/-	۲۴	انسان اور اس کے مسائل	۳۰/-
۴	کمزور اور مظلوم اسلام کے سایہ میں	۵۰/-	۲۵	اسلام اور مشکلات حیات	۲۵/-
۵	صحت ومرض اور اسلامی تعلیمات	۴۰۰/-	۲۶	خدا کی غلامی - انسان کی معراج	۱۳/-
۶	خدا اور رسول کا تصور - اسلامی تعلیمات میں	۱۳۰/-	۲۷	اسلام اور وحدت بنی آدم	۱۶/-
۷	معروف ومنکر	۱۸۵/-	۲۸	اسلام میں خدمت خلق کا تصور	۱۱۰/-
۸	اسلام کی دعوت	۱۵۰/-	۲۹	انفاق فی سبیل اللہ	۲۰/-
۹	غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	۱۸۵/-	۳۰	دولت میں خدا اور بندوں کا حق	۱۲/-
۱۰	تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث	۱۰۰/-	۳۱	انسانوں کی خدمت - اسلام کی نظر میں	۱۲/-
۱۱	عورت - اسلامی معاشرے میں	۱۸۰/-	۳۲	جماعت اسلامی ہند - پس منظر، خدمات اور طریق کار	۳۵/-
۱۲	مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ	۱۰۰/-	۳۳	ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟	۸/-
۱۳	عورت اور اسلام	۵۰/-	۳۴	ملک وملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں	۳۲/-
۱۱۴	اسلام کا عائلی نظام	۹۰/-	۳۵	یہ ملک کدھر جارہا ہے؟	۲۰/-
۱۵	مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	۱۵/-	۳۶	وقت حساب	۱۵/-
۱۶	قرآن کا نظام خاندان	۱۸/-	۳۷	آخرت کے عذاب سے خاندان کو بچایئے	۱۰/-
۱۷	بچے اور اسلام	۱۰/-	۳۸	اسلام کا شورائی نظام	
۱۸	اسلام - ایک دین دعوت	۱۰/-	۳۹	فقہی اختلافات کی حقیقت	۱۵/-
۱۹	دعوت وتربیت - اسلام کا نقطۂ نظر	۵۵/-	۴۰	بعض اہم اسلامی اصطلاحات کی تشریح	۱۸/-
۲۰	ہندوستان میں اسلام کی دعوت - اہمیت اور تقاضے	۵/-	۴۱	سوئے حرم چلا	۳۲/-
۲۱	قرآن مجید کا تصور تزکیہ	۱۸/-	۴۲	دینی علوم کی تدریس	۱۰/-

ملنے کے پتے:
۱- ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، نئی نگر، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ - ۲
۲- مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی - ۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵